www.shibliinternational.com

February 2019

ماہنامہ صدائے شبلی حیدرآباد

Urdu Monthly SADA E SHIBLI Hyderabad

Vol-1, Issue-12

ایڈیٹر مولانا ڈاکٹر محمد محامد ہلال اعظمی

10/- روپے

فروری Feb :2019

علمی، ادبی، سائنسی، مذہبی، سماجی اور معلوماتی شاہکار

جلد: 1 Vol: 1 ۔ شمارہ: 12 Issue12

ماہنامہ حیدرآباد

صدائے شبلی

مدیر: ڈاکٹر محمد محامد ہلال اعظمی

نائب مدیران: ڈاکٹر سراج احمد انصاری ☆ ڈاکٹر عبد القدوس ☆ ابو ہریرہ یوسفی

مجلس مشاورت:

پروفیسر اشتیاق احمد ظلی، استاذ الاساتذہ حضرت رحمٰن جامی
پروفیسر مظفر علی شہہ میری، پروفیسر محسن عثمانی ندوی
پروفیسر ابوالکلام پروفیسر شاہد نوخیز اعظمی،
ڈاکٹر محمد الیاس اعظمی، مولانا ارشاد الحق مدنی،
مولانا محمد مساعد ہلال احیائی، اعجاز علی قریشی ایڈوکیٹ
محمد سلمان انجینئر

مجلس ادارت:

ڈاکٹر محمد رفیق، ڈاکٹر حمران احمد، ڈاکٹر جاوید کمال
ڈاکٹر مختار احمد فردین، ڈاکٹر غوثیہ بانو، ڈاکٹر سید امام
حبیب قادری، ڈاکٹر سمیہ تمکین، ڈاکٹر فاروق احمد بھٹ
ڈاکٹر محمد زبیر، ڈاکٹر مصطفیٰ خان، ڈاکٹر محمد فضیل ندوی،
ڈاکٹر مصلح الدین نظامی، ابو ہریرہ ایوبی، محسن خان

قیمت فی شمارہ: 15
سالانہ: 150 - بیرونی ممالک: 50/ امریکی ڈالر
خصوصی تعاون: 1000

MOHD MUHAMID HILAL
A/c: 52023475202
Ifsc: SBIN0020413
Micr: 500002311 Branch: Dabeerpura Hyd

ماہنامہ "صدائے شبلی" حیدرآباد میں مقالہ نگاران سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے

ہر طرح کی قانونی چارہ جوئی صرف حیدرآباد کی عدالت میں ہوگی

محمد محامد ہلال (اونر، پبلشر، پرنٹر، ایڈیٹر) نے دائرہ الیکٹرک پریس میں چھپوا کر حیدرآباد تلنگانہ سے شائع کیا

خط و کتابت کا پتہ

MOHD MUHAMID HILAL #17-6-352, B1, 2nd Floor,Bafana Complex,
Near Asfya Masjid Dabirpura Road, Purani Haveli,Hyderabad- 500023. T.S

فہرست مضامین

۱	اپنی باتیں	ڈاکٹر محمد محامد ہلال اعظمی	۵
۲	عباداتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم	علامہ شبلی نعمانیؒ	۶
۳	دیباچوں میں ذکر شبلی کا مطالعہ (قسط:۹)	ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی	۷
۴	ملت کے مسائل کا حل قرآن کی روشنی میں	مولوی صفوۃ الرحمٰن	۱۰
۵	مساجد سے وابستگی اسلام کا لازمی حصہ	مفتی شکیل احمد رحمانی	۱۲
۶	قرآن اور آج کا مسلمان (نظم)	سید معین الدین حسینی ہاشم	۱۴
۷	اردو افسانہ اور محشر عابدی	ڈاکٹر رفیعہ شمیم	۱۵
۸	بیت المقدس مسلمانوں کی مذہبی میراث	مفتی امانت علی قاسمی	۱۹
۹	غزل	علینا عترت	۲۰
۱۰	غزل	رہبر پرتاب گڑھی	۲۲
۱۱	منصور ہند صوفی سرمد شہید۔۔۔کتاب زیست کے چند گم شدہ اوراق	مولانا افتخار رحمانی	۲۳
۱۲	حیات اللہ انصاری کے افسانوں میں نچلے طبقے کے بچوں کی عکاسی	ثنا غزل	۲۷
۱۳	غزل	عبدالمنان صمدی	۳۲
۱۴	واٹر	محمد نہال افروز	۳۳
۱۵	غزل	مسیح الدین نذیری	۳۴
۱۶	تصویر کے دو پہلو	سیدہ تبسم منظور	۳۵
۱۷	شاہ جلیل الحق قادری بقاء	حکیم سید شاہ محمد خیر الدین قادری، صوفی	۳۸
۱۸	قارئین کے خطوط	مولانا انصار احمد۔ڈاکٹر محمد فضیل ندوی	۳۹
۱۹	تبصرہ کتب	ابو ہریرہ یونسی	۴۱

ماہنامہ ''صدائے شبلی'' کے خصوصی معاونین

ابو سفیان اعظمی، مقیم حال ممبئی.....الحاج **محمد منیر الدین عرف ولی**، آغا پورہ حیدرآباد

ڈاکٹر سید **جلیل حسین** ایم ڈی (علیگ) ٹولی چوکی حیدرآباد.....الحاج **محمد عبد الستار** سیکھ ویلج سکندرآباد حیدرآباد

علی میاں احمد پٹھان رائے گڑھ (مہاراشٹر).....**علی احمد عبد اللہ** کونچالی، رائے گڑھ (مہاراشٹر)

الحاج **رئیس احمد اقبال** انجینئر، سیکھ ویلج سکندرآباد حیدرآباد.....**محمد عبد الماجد** ایڈوکیٹ، سکندرآباد، حیدرآباد

جناب قاضی **فیض الدین**، اپر توڑیل، مہاڈ، رائے گڑھ مہاراشٹرا۔ڈاکٹر **شہباز احمد**، پروفیسر گورنمنٹ نظامیہ طبی کالج چارمینار، حیدرآباد.....مولانا **محمد عبد القادر سعود** نائس جوس سینٹر سکندرآباد، حیدرآباد۔

الحاج **محمد قمر الدین** نبیل کالونی بارکس حیدرآباد

اداریہ

اپنی باتیں

انہیں لوگوں کے لیے نصیب ہوتا ہے، جو کسب وجستجو کرتے ہیں۔ محنت تو سبھی کرتے ہیں، لیکن وہی محنت کارگر ہوتی ہے، جس میں راستہ سیدھا اور نیت صاف ہو۔ اسی میں ملک، عالم، انسانیت کی بھلائی ہے۔ موجودہ دور میں عدلیہ، انصاف، انتظامیہ، حسن انتظام، مقننہ، یقینی خدمت اور ذرائع ابلاغ یعنی پرنٹ میڈیا، الیکٹرانک میڈیا، بیشتر اپنے کو حق گردانے پر مصر ہیں، وہ اپنے آپ کو خوش فہمی میں مبتلا کیے ہوئے ہے کہ ہمیں حقیقی خادم ہیں، لیکن ایک باضمیر انسان کو کہیں مقتول کی چیخیں، تو کہیں عصمت دری، تو کہیں کرپشن اور کمیشن کے واقعات بندر بانٹ کی طرح دکھائی دے دیتے ہیں۔ اکثر لوگ رب چاہی، قانون چاہی زندگی کو چھوڑ کر دنیا چاہی اور من چاہی زندگی پر چلنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ یہ انسانیت کی بقا کے لیے سمِ قاتل ہے، جس کی وجہ سے حال اور مستقبل میں ملک وملت کا بڑا نقصان ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک ہاتھ سے تالی نہیں بجتی بلکہ دونوں ہاتھوں کو ملانا پڑتا ہے۔ اسی طرح کسی بھی ملک کی ترقی کا راز خاص وعام دونوں پر منحصر ہوتا ہے، اگر ایک طرف یوں کہا جائے کہ جو اصولِ گلستاں سے واقف نہ تھے، نظام چمن ان کے ہاتھ آ گیا، تو دوسری طرف یوں کہا جائے گا کہ افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر، ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارہ، یا یوں کہا جائے کہ اپنی مدد آپ پیدا کر ؎

دریا کے تلاطم سے بچ سکتی ہے کشتی
کشتی میں تلاطم ہو تو ساحل نہ ملے گا

حالیہ دنوں میں کچھ ایسے واقعات نظروں سے گزرے ہیں کہ جس سے انسان اور انسانیت شرمندہ ہوئے نہیں بچ سکتی۔ ایک مرغیوں سے بھری بس الٹ گئی، معدودے چند کے بیشتر مرغیوں کو ہنستے، پکڑتے، لوٹتے اور بھاگتے ہوئے نظر آتے ہیں، اسی طرح تیز رفتار ٹرین پٹری سے اتر گئی، محو خواب موت کے آغوش میں چلے گئے اور زخمیوں کی حالت ناگفتہ بہ ہوگئی، اس وقت انہیں مدد کی ضرورت تھی مگر عوام کی نظر حریص ان کے سامان پر مرکوز ہوگئی۔ اسی طرح ایک کل ہند نمائش میں آگ لگ گئی، لوگوں کو چاہئے تھا کہ آگ بجھانے میں مدد کریں یا دوکاندار کے سامان کم سے کم خاکستر ہونے سے بچائیں، ہوا یوں کہ لوگ تو ویڈیو بنانے یا فوٹو کھینچنے میں یا سامان لوٹنے میں مصروف ہوگئے، یہ چند مناظر سوشل میڈیا پر ویڈیو کی شکل میں موجود ہیں، جو ہمارے سماج کی بے غیرتی، بے حیائی اور سطحی سوچ کا پتہ دیتے ہیں۔ آج ہمارے سماج کو دنیاوی زندگی نے دھوکہ میں ڈال رکھا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ سماج میں ہمدردی، غم خواری، اخوت تعاون، ایثار اور نثار کا جذبہ پیدا ہو، یہ باتیں دنیا کے تمام مذاہب میں موجود ہیں اور بالخصوص اسلام نے اور اسلام کے حقیقی ماننے والوں نے دنیا کو یہ پیغام دیا کہ مصائب وآلام کی گھڑیوں میں عوام کے لیے بلالحاظ مذہب وملت کے مقیم ومسافر اپنا صد فیصد تعاون دینا چاہئے۔ کیونکہ ؎

اس نفع وضرر کی دنیا میں یہ ہم نے دیا ہے درس جنوں
اپنا تو زیاں منظور سہی اوروں کا زیاں منظور نہیں

معزز قارئین! صدائے شبلی کا تازہ شمارہ اور سبھی شمارے ہماری ویب سائٹ www.shibliinternational.com پر دستیاب ہیں، ہم امید کرتے ہیں کہ آپ اس سے استفادہ کریں گے۔

مولانا ڈاکٹر محمد محامد ہلال اعظمی

عباداتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم

علامہ شبلی نعمانیؒ

دوام ذکر الٰہی: قرآن مجید میں اہل ایمان کا یہ وصف خاص بیان کیا ہے:

الذین یذکرون اللہ قیاماً وّقعوداً وّ علی جنوبھم (آل عمران ۳:۱۹۱)

جو خدا کو اٹھتے بیٹھتے، لیٹتے یاد کرتے ہیں۔

لا تلھیھم تجارۃٌ وّ لا بیع عن ذکر اللہ (نور۔۲۴:۳۷)

جن کو اشتغالِ دنیوی خدا کی یاد سے غافل نہیں کرتے۔

اور قرآن کا مبلغ ان اوصاف کا خود بہترین مظہر تھا، حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ آنحضرت ﷺ ہر لحظہ اور ہر لمحہ خدا کی یاد میں مصروف رہتے تھے، ربیعہ بن کعب اسلمی رات کو آپؐ کے آستانہ پر پہرہ دیتے تھے، وہ بیان کرتے ہیں کہ آپؐ تسبیح وتہلیل کی آواز سنتے سنتے میں تھک جاتا تھا اور مجھے نیند آجاتی تھی، اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے، کھاتے پیتے، سوتے جاگتے، وضو کرتے، نئے کپڑے پہنتے، سوار ہوتے، سفر میں جاتے، واپس آتے، گھر میں داخل ہوتے، مسجد میں قدم رکھتے، غرض ہر حالت میں دل وزبان ذکر الٰہی میں مصروف رہتے، چنانچہ اسی بنا پر احادیث میں مختلف اوقات وحالات کے لیے کثرت سے ادعیہ ماثورہ منقول ہیں، اخیر زندگی میں جب سورۂ اذا جآء اتری جس میں تحمید وتسبیح کا حکم ہے، تو امہات المومنین کا بیان ہے کہ ہر وقت اور ہر حالت میں زبانِ مبارک پر تسبیح جاری رہتی تھی۔

حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ آپؐ اکثر یہ دعا **رب اغفرلی وتب علیّ انک انت التواب الغفور** تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد پڑھا کرتے تھے، ہم نے گنا تو ایک ایک نشست میں سو سو دفعہ یہ الفاظ آپؐ کی زبان سے ادا ہوئے، سفر اور کوچ کی بے اطمینانی میں بھی آپؐ یادِ الٰہی سے غافل نہیں ہوتے تھے، سواری پر بیٹھے بیٹھے نفل ادا کرتے تھے اور اس کی پروا نہیں کرتے تھے کہ قبلہ کی طرف رخ ہے یا نہیں، سواری کا جانور جدھر چل رہا ہوتا آپؐ اس ادھر ہی منہ کیے نماز کی نیت کر لیتے کہ **اینما تولو افثم وجہ اللہ** (بقرہ۔۲:۱۱۵) جدھر رخ کر ادھر ہی خدا کا منہ ہے۔

ذوق وشوق: (آپؐ اصحابؓ کی محفل میں یا امہات المومنینؓ کے حجروں میں بات چیت میں شب بیداری میں گذرتا تھا، تاہم صبح کے وقت ادھر مؤذن نے اللہ اکبر کہا، ادھر آپؐ بستر سے اٹھ بیٹھے، شب کے وقت جس ذوق، شوق اور وجد کی حالت میں نماز پڑھتے اس کا نقشہ حضرت عائشہؓ نے ان الفاظ میں کھینچا ہے ''کبھی پوری پوری رات آنحضرت ﷺ کھڑے رہتے، سورہ بقرہ، سورہ آل عمران، سورہ نساء (قرآن کی سب سے بڑی سورتیں ہیں) پڑھتے، جب کوئی خوف اور خشیت کی آیت آتی، خدا سے مانگتے اور پناہ طلب کرتے، کوئی رحمت اور بشارت کی آیت آتی تو اس کے حصول کی دعا مانگتے''۔ قرأت اتنی زور سے فرماتے کہ دور دور تک آواز جاتی اور لوگ اپنے بستروں پر پڑے پڑے آپؐ کی آواز سنتے، کبھی کبھی کوئی ایسی آیت آجاتی کہ آپؐ اس کے ذوق وشوق میں محو ہو جاتے، حضرت ابوذرؓ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ آپؐ نے نماز میں یہ آیت پڑھی:

ترجمہ: اگر تو سزا دے تو تیرے بندے ہیں اور اگر معاف کر دے تو تو غالب اور حکمت والا ہے۔

تو یہ اثر ہوا کہ صبح تک آپؐ یہی آیت پڑھتے رہ گئے۔

(سیرۃ النبیؐ، ج:۲۔ص:۲۰۵ تا ۲۰۶)

قسط:(۹)　　ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی۔　9838573645

دیباچوں میں ذکر شبلی کا مطالعہ

مولانا عبدالسلام ندوی

مولانا عبدالسلام ندوی (۱۸۸۳-۱۹۵۶ء) علامہ شبلی کے ارشد تلامذہ میں سے ہیں انھوں نے انہی سے تصنیف وتالیف کی تربیت حاصل کی تھی، مولانا شبلی نے ابوالکلام آزاد اور مولانا سید سلیمان ندوی کی طرح انھیں بھی ماہنامہ الندوہ کا نائب ایڈیٹر مقرر کیا تھا اور انھوں نے اسے بڑی خوبی سے نکالا، ماہنامہ الندوہ نے جن اہل قلم کو ملک میں بہ حیثیت اہل قلم روشناس کرایا ان میں مولانا عبدالسلام ندوی کا نام بہت نمایاں ہے۔ وہ شعروادب کے بڑے پارکھ اور اداشناس تھے۔

مولانا شبلی کی وفات ۱۸/ نومبر ۱۹۱۴ء کے بعد ان کے ادھورے کاموں کی تکمیل کا آغاز ہوا تو مولانا سید سلیمان ندوی سیرۃ النبی کی تکمیل میں مصروف ہوئے اور مولانا عبدالسلام ندوی نے اسوۂ صحابہ کی تکمیل کا بیڑا اٹھایا اور دو جلدوں میں اسوۂ صحابہ لکھی جو نہ صرف دارالمصنفین کی بہت اہم اور منفرد کتاب ہے بلکہ اردو زبان کی بھی ایک شاہکار کتاب ہے۔

مولانا عبدالسلام ندوی کی ایک بڑی حیثیت مترجم کی ہے۔ انھوں نے متعدد اہم کتابوں کے ترجمے کئے ہیں، اسی سلسلہ کی ایک کڑی تاریخ فقہ اسلامی بھی ہے جو علامہ محمد خضر مرحوم کی کتاب کا ترجمہ ہے، اس کتاب کا دارالمصنفین سے کئی ایڈیشن نکل چکا ہے۔ اس کے دیباچہ سے معلوم ہوتا ہے کہ علامہ شبلی کے پیش نظر اسلامی علوم وفنون کی تدوین کا منصوبہ بھی تھا، مولانا عبدالسلام ندوی لکھتے ہیں:

"اردو زبان میں جدید طرز پر علوم اسلامیہ کی تاریخ کا خاکہ سب سے پہلے علامہ شبلی مرحوم نے قائم کیا اور علم کلام کی تاریخ میں علم الکلام کے نام سے ایک مستقل کتاب لکھی اور چار پانچ جلدوں میں فارسی شاعری کی ایک مبسوط تاریخ مدون کی۔ اس کے بعد اگرچہ سیرت نبویؐ کی تالیف نے ان کو اس سلسلہ کی طرف متوجہ ہونے کا موقع نہیں دیا تاہم وہ علوم اسلامیہ کی تاریخ کی تکمیل کا بار بار ذکر کرتے رہتے تھے اور اس کو اردو زبان کے لئے ایک جدید تاریخی موضوع خیال کرتے تھے، اگر وہ اپنی زندگی میں سیرت نبویؐ کی تکمیل سے فارغ ہوسکتے تو بہت ممکن تھا کہ اس دلچسپ موضوع کی طرف دوبارہ متوجہ ہوتے لیکن افسوس ہے کہ زندگی نے ان کو سیرت نبویؐ کے مکمل کرنے کا موقع نہیں دیا، پھر اور سلسلوں کی تکمیل تو ایک عالم خیال کی چیز تھی تاہم جب ان کی یادگار میں دارالمصنفین قائم کیا گیا تو اس کا خاص طور پر خیال رکھا گیا کہ یہ انتساب تیمنا وتبرکا نہ ہو بلکہ اس کو حقیقی طور پر ان کے نام کے زندہ رکھنے کا ذریعہ بنایا جائے، اس لئے ابتدا ہی سے یہ لحاظ رکھا گیا کہ سیرت نبویؐ کے علاوہ ان کے دماغ نے اور جن تاریخی سلسلوں کا خاکہ قائم کیا تھا ان کی تکمیل کی جائے، چنانچہ آج تک دارالمصنفین سے جو تاریخی اور مذہبی کتابیں شائع ہوئیں ہیں ان میں تقریباً اکثر ان ہی سلسلوں سے تعلق رکھتی ہیں اور تاریخ فقہ اسلامی بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے"۔ (تاریخ فقہ اسلامی، دیباچہ ص ۱۲۔ ۱۳، دارالمصنفین اعظم گڑھ،

۲۰۱۳ء)

مولانا عبدالسلام ندوی نے علامہ شبلی کے خطبات کے مجموعہ پر جو پہلی بار دارالمصنفین سے ۱۹۴۱ء میں شائع ہوا تھا دیباچہ لکھا ہے اور علامہ شبلی کی خطابت اور خطیبانہ شان کا ذکر کیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

''مولانا شبلی نعمانی جن اوصاف وخصوصیات کا مجموعہ تھے ان میں ایک خاص خصوصیت یہ تھی کہ ان میں زور تحریر کے ساتھ قوت تقریر کا خداداد ملکہ بھی پایا جاتا تھا''۔

''خوش قسمتی سے تقریر وزور بیان کے لئے جس قدر لوازم واوصاف ضروری ہیں وہ سب ان میں قدرتی طور پر موجود تھے، قد بلند وبالا تھا اس لئے جب اسٹیج پر تقریر کرنے کے لئے کھڑے ہوتے تھے تو ہر شخص کے سامنے ظاہری حیثیت سے بھی ایک نمایاں شخصیت آجاتی تھی۔ آواز بلند اور گونجنے والی تھی اور اول سے آخر تک یکساں حالت میں قائم رہتی تھی، مزاج میں نیابت اشتعال اور جوش وخروش پایا جاتا تھا اس لئے ان کی تقریروں میں قدرتی طور پر زور اور جوش پیدا ہوجاتا تھا''۔

(خطبات شبلی

ص۵۔۶، طبع جدید ۲۰۰۸ء)

علامہ شبلی کی تقریروں کے موضوعات کے بارے میں لکھتے ہیں:

''ان کی تقریروں کے موضوع یا تو خالص علمی ہوتے تھے مثلاً اعجاز القرآن، علم الکلام اور فارسی شاعری کی تاریخ یا مذہبی مثلاً ختم نبوت اور تکمیل دین یا قومی جس میں زیادہ تر دین ودنیا کی آمیزش یا علوم قدیمہ وجدیدہ یا معقول ومنقول کی تطبیق پر زیادہ زور دیتے تھے اور تمام موضوع قرآن وحدیث اور تاریخ کے ٹھوس معلومات سے لبریز ہوتے تھے''۔ (ایضاص۶)

علامہ شبلی کی وفات کے بعد جب دارالمصنفین کے علمی کاموں کا آغاز ہوا تو سید صاحب سیرۃ النبیؐ میں مصروف ہوئے اور مولانا عبدالسلام ندوی نے ''اسوۂ صحابہ'' کا آغاز کیا، اس کا خواب علامہ شبلی ہی نے دیکھا تھا اور امین زبیری کو لکھا تھا کہ کام بہت وسیع ہے، بیگم بھوپال کے کان میں بات ڈال دیجئے۔

مولانا عبدالسلام ندوی نے دوجلدوں میں اسوۂ صحابہ اور ایک مختصر سی کتاب اسوۂ صحابیات لکھی، یہ اپنے موضوع پر اردو میں پہلی کتاب تھی، اس کی انفرادیت کا ذکر متعدد اہل قلم نے کیا ہے۔ اس کی تصنیف کا مقصد یہ تھا کہ صحابۂ کرامؓ کی مقدس زندگیاں اس طرح سامنے آجائیں کہ لوگوں کو شوق عمل پیدا ہو، اس خیال کا سہرا وہ اپنے استاذ علامہ شبلی کے سر باندھتے ہیں، وہ لکھتے ہیں:

''یہی وجہ ہے کہ اس دور تجدید واصلاح میں ہندوستان کے مجدد اعظم مولانا شبلی مرحوم کو جب مسلمانوں کی ترقی واصلاح کا خیال پیدا ہوا تو انھوں نے اسی تریاق اکبر کو اس درد کا علاج قرار دیا اور ہمیشہ اس فکر میں رہے کہ صحابۂ کرام کے فضائل ومناقب اس ترتیب وجامعیت کے ساتھ لکھے جائیں کہ دنیا کے سامنے معاشرت واخلاق اور عبادات ومعاملات کا بہترین عملی مجموعہ آجائے''۔ (اسوہ صحابہ ج۱، ص۵۔۶)

اسوۂ صحابہ کو وہ علامہ شبلی کے ذہنی خاکہ پر مشتمل بتاتے ہیں:

''مولانائے مرحوم نے اس کتاب کا جو ذہنی خاکہ قائم کیا تھا اسی کے مطابق کتاب کی ترتیب وتدوین کا سلسلہ جاری ہوا''۔ (ایضاص۷)

جس خاکہ کا ذکر مولانا عبدالسلام ندوی نے کیا ہے وہ شبلی کی تحریروں میں کہیں نہیں ملتا، یہ مولانا عبدالسلام ندوی کی روایت ہے۔ یہ بھی ایک واقعہ ہے کہ حدیث شبلی کی روایت میں مرویات سلیمانی کو تو بڑی اہمیت حاصل ہے اور مرویات عبد السلام کی تدوین ہی نہ ہوسکی۔

مولانا عبدالسلام ندوی اردو کے ایک بڑے ادیب

ونقاد تھے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ تلامذہ شبلی میں شعر وادب کے وہ سب سے بڑے ادا شناس تھے، یہی وجہ ہے کہ شعر الہند کی تصنیف کا کام انھیں سونپا گیا، چنانچہ دو جلدوں میں انھوں نے اردو شعر وادب کی بڑی عمدہ تنقیدی تاریخ لکھی ، اس کے دیباچے میں انھوں نے موضوع کی وضاحت کے ساتھ اس پر اجمالی تبصرہ بھی کیا ہے۔ یہاں یہ بات عرض کرنا شاید بے محل نہ ہو کہ انھوں نے بھی اپنے استاذ علامہ شبلی کو شعر الہند میں جگہ نہیں دی ہے، البتہ اس کے دیباچہ میں فن تنقید کے ضمن میں سب سے آخر میں موازنہ انیس کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ:

''سب سے اخیر میں مولانا شبلی مرحوم نے موازنہ انیس اور مرزا دبیر کے مرثیوں پر اصولی حیثیت سے نہایت تفصیل کے ساتھ تنقید کی، جو اگرچہ صرف شاعری کی ایک ہی نوع یعنی مرثیہ تک محدود ہے لیکن اس میں مرثیہ کے تعلق سے مختلف اصناف مثلاً رزمیہ، مناظر قدرت، واقعاتی اور جذباتی شاعری کے متعلق بھی نہایت عمدہ تنقیدی اصول مذکور ہیں''۔ (شعر الہند ج ۲ ص ۱۰)

اردو میں تاریخی سوانح عمریوں کا آغاز علامہ شبلی کی کتابوں سے ہوا، پھر اس کا عام رواج ہو گیا، چنانچہ متعدد سوانح عمریاں اہل قلم نے لکھیں، اس سلسلہ کو مولانا عبد السلام ندوی نے بھی ''امام رازی'' لکھ کر ترقی دی اور بلاشبہہ یہ امام رازی کی نہایت مستند اور بڑی محققانہ کتاب ہے اور تقریباً الغزالی کے انداز میں لکھی گئی ہے۔ مولانا عبد السلام ندوی نے بھی اس کا ذکر کیا ہے، لکھتے ہیں:

''جس طرح مولانا شبلی مرحوم نے الغزالی میں فلسفہ وعلم کلام کے متعلق امام غزالی کے خیالات ونظریات کی تشریح کی ہے اسی طرح امام رازی کے خیالات ونظریات کی تشریح کی بھی ضرورت تھی اور یہ کتاب اسی ضرورت کو پیش نظر رکھ کر لکھی گئی ہے''۔
(امام رازی دیباچہ ص ۱-۲، اعظم گڑھ، ۱۹۵۰ء)

مولانا عبد السلام ندوی کی دوسری سوانحی کتاب ''سیرت عمر بن عبد العزیز'' ہے، گو یہ علامہ شبلی ہی کے انداز میں لکھی گئی ہے مگر شبلی کے سلسلہ کی نہیں ہے، حضرت عمر بن عبد العزیز اگرچہ بنو امیہ میں سے تھے مگر بنو امیہ میں علامہ شبلی نے ولید بن عبد الملک کا انتخاب کیا تھا، مولانا عبد السلام ندوی نے علامہ شبلی کے سلسلہ نامور فرماں روایان اسلام کے انتخاب کو نقل کر کے لکھتے ہیں:

''اسلام کی تاریخ تمام دنیا کی تاریخوں سے مختلف ہے، اس کا روشن ترین زمانہ صرف وہ ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے شروع ہوا اور خلافت راشدہ تک پہونچ کر ختم ہو گیا، اس لئے خلفائے اسلام کا قابل فخر کارنامہ یہ نہیں ہے کہ انھوں نے دنیا کو اس نقطۂ نورانی سے آگے بڑھایا بلکہ ان کا حقیقی شرف یہ ہے کہ انھوں نے زمانہ کو اس قدر پیچھے ہٹایا کہ وہ عہد صحابہ سے جا کر مل گیا۔

خلافت راشدہ کے بعد بنو امیہ کا دور حکومت شروع ہوا جس میں بڑے بڑے فرماں روا گذرے، عبد الملک نے ۲۱/ سال حکومت کی اور سلطنت کی بنیاد کو مستحکم کر دیا، ولید نے اس کثرت سے فتوحات کیں اور اس کثرت سے عمارتیں تعمیر کرائیں کہ تمام دنیا اسلامی تمدن کا تماشہ گاہ بن گئی۔

لیکن ان میں صرف حضرت عمر بن عبد العزیزؒ ایک ایسے شخص ہیں جنھوں نے زمانے کی باگ پھیر کر اس کو عہد صحابہ سے ملا دیا''۔ (سیرت عمر بن عبد العزیز ص ۲)

یہ در اصل مولانا شبلی کے سلسلہ نامور فرماں روایان اسلام پر ایک تنقید ہے مگر جس ادب واحترام سے اور جس انداز سے تنقید کی گئی ہے وہ ہماری تصنیفی تہذیب کا نمونہ ہے، اپنی بات کس طرح کہی جاتی ہے جس سے دوسرے کی تردید ہو جائے اور احترام پر حرف نہ آئے، یہ اس کا بہترین نمونہ ہے۔

مولوی صفوۃ الرحمٰن صابرؔ۔ حیدرآباد

ملت کے مسائل کا حل قرآن کی روشنی میں

دنیا میں امتحان وآزمائش کے لیے اچھائی وبرائی، اطاعت ونافرمانی کرنے کی آزادی ہوگئی ہے اور قانونِ مہلت کے تحت ان کا پورا بدلہ دنیا میں فوری نہیں دیا جاتا بلکہ کچھ مزا چکھایا جاتا ہے پھر بھی یہ ظالم ونافرمان اپنی حرکتوں سے باز نہیں آتے، اس سے یہ بدگمانی ہوتی ہے کہ کائنات کا کوئی فرمانروا نہیں ہے اور اگر ہے بھی تو غافل، بے انصاف وبے رحم ہے، حالانکہ مکافاتِ عمل (شامتِ اعمال) کا قانون الٰہی دنیا میں بھی جاری وساری ہے جو اپنے وقت پر ہی کام کرتا ہے، یہ قانون اس لیے نافذ کیا گیا کہ جس طرح دنیا کی تکلیف ومصیبت سے نہ صرف وقتی طور پر چھٹکارا پانے کی کوشش کی جاتی ہے بلکہ آئندہ کے لیے بھی بچاؤ کی تدابیر اختیار کی جاتی ہیں۔ عقل وفطرت کے ان تقاضوں کے تحت ابدی زندگی حیات بعد الموت جو کہ یقینی ہے وہاں کے عذاب سے بچنے کی بھی اسی طرح کوشش کرنے کا خیال پیدا ہوا، جیسا کہ فرمایا گیا **وبلونٰھم بالحسنٰت والسیات لعلھم یرجعون** (اعراف ۱۶۸)

''اور ہم ان کو راحت ومصیبت سے آزماتے ہیں تاکہ ان میں ابدی زندگی کی فکر پیدا ہو''۔ **ظھر الفساد فی البر والبحر بما کسبت ایدی الناس لیذیقھم بعض الذی عملوا لعلھم یرجعون** (الروم ۴۱)

''انسانوں کے اپنے ہاتھوں خشکی وتری میں فساد پھیل گیا ہے، ان کو ان کے بعض کرتوتوں کا مزہ اس لیے چکھایا جاتا ہے کہ وہ باز آجائیں اور ابدی زندگی کے متعلق بھی فکر کریں''۔

اللہ تعالیٰ نہ صرف خالقِ کائنات ہے بلکہ بلاشرکت غیرے وہی تنہا واکیلا فرمانروائے کائنات بھی ہے، جس نے اپنے اس نظام مملکت کو امن وسلامتی سے چلانے کے لیے ابتداء ہی سے کتاب وپیغمبر کے ذریعہ سامان ہدایت فراہم کرتے ہوئے صاف طور پر بتادیا کہ دنیا میں میرے بتائے ہوئے طریقے پر زندگی بسر کرنے کی کوشش کروگے تو نہ صرف ابدی زندگی میں تم کو نہ خوف ہوگا اور نہ ہی غم ہوگا، جیسا کہ فرمایا گیا **قلنا اھبطوا منھا جمیعا، فاما یاتینکم منی ھدی فمن تبع ھدای فلا خوف علیھم ولاھم یحزنون** (البقرہ ۳۸)

''ہم نے حکم دیا یہاں سے سب کے سب اتر جاؤ (جب بھی ضرورت ہوگی) میری طرف سے ہدایت آتی رہے گی، پس جو کوئی میری ہدایت کی پیروی کرے گا پس ان ہی کو نہ کوئی خوف اور نہ ہی وہ غمگین ہوں گے''۔ یہی بات سورہ الاعراف آیت ۳۵ کے علاوہ سورہ طٰہٰ ۱۲۳ میں بھی فرمائی گئی ہے، بلکہ دنیا میں بھی امن وسلامتی کے ساتھ زندگی بسر کرسکوگے، جیسا کہ بتادیا گیا **الذین اٰمنوا ولم یلبسوا ایمانھم بظلم اولئک لھم الامن وھم مھتدون** (الانعام ۸۲)

''جو لوگ ایمان لائے اور اپنے ایمان کو شرک کے اجزاء سے پاک رکھنے کی کوشش کیے، ان کے لیے امن ہے اور وہی ہدایت یافتہ ہیں''۔ **من عمل صالحا من ذکر او انثیٰ**

وهو مؤمن فلنحيينه حيوٰة طيبة، ولنجزينهم اجرهم باحسن ما كانوا يعملون (النحل ۹۷)

''جوکوئی (مرد ہو یا عورت) اپنے ایمان کو شرک کے اجزاء سے پاک رکھ کر عمل صالح کرے گا تو ہم اس کو (دنیا میں بھی) حیات طیبہ عطا کریں گے اور یقیناً ان کو ان کے اعمال کا (اچھا) بدلہ دیں گے، جن کو وہ لگن کے ساتھ کیے ہوں''۔ قل یعبادالذین اٰمنوا اتقوا ربکم، للذین احسنوا فی ھذہ الدنیا حسنة، وارض اللہ واسعة، انما یوفی الصٰبرون اجرھم بغیر حساب (الزمر۱۰)

''(اے نبیؐ) میرے بندوں سے کہو جو ایمان لائے ہیں کہ وہ اپنے رب کی نافرمانی سے بچنے کی مقدور بھر کوشش کرتے رہیں جو آخرت (حیات بعدالموت کی) ابدی زندگی کے لیے اس دنیا میں اچھے عمل کریں گے، ان کے لیے دنیا میں بھی بھلائی ہے، کسی مقام یا ذریعہ معاش میں ایسا کرنے سے تم قاصر ہو تو مقام یا ذریعہ معاش بدل دو کیونکہ اللہ کی زمین بے حد وسیع اور ذرائع رزق بھی بے حساب ہیں، اس پر بھی رزق میں کشادگی نہ ہو تو صبر کرو کیونکہ صبر کرنے والوں کو بے حساب اجر دیا جائے گا''۔ یہی بات النحل میں بھی ہے، وقیل للذین اتقو ماذا انزل ربکم، قالوا خیرا، للذین احسنو فی ھذہ الدنیا حسنة، ولدار الاخرة خیر، النعم دار المتقین ۳۰

''اور جو اپنے رب کی نافرمانی کرنے سے بچنے کی کوشش کرتے ہیں جب ان سے پوچھا جاتا ہے کہ تمہارے رب نے کیا چیز نازل کی ہے تو وہ کہتے ہیں کہ بہترین (بات) جو بھلائی کیے تو ان کے لیے دنیا میں بھلائی ہے اور آخرت کا گھر تو سب سے بہتر ہے اور نافرمانی کرنے سے بچنے والوں کے لیے کیا ہی خوب مقام ہے''۔

فرمانروائے کائنات کے ان قوانین کے اٹل، صحیح و سچ ہونے کے گواہ دنیا کے تاریخی واقعات ہیں، اس کے باوجود ظالم، کافر اور نافرمان اپنے برے کرتوتوں ہی میں مشغول ہیں، ان پر عذابِ الٰہی کا نزول نہ ہونے کی وجہ اللہ نے اپنی ہی کتاب صاف طور پر بیان کر دیا ہے:

۱) ذٰلک ان لم یکن ربک مھلک القریٰ بظلم واھلھا غٰفلون (الانعام ۱۳۱)

''رب کا قانون یہ ہے کہ ظالم بندوں کو (کتاب ورسول کے ذریعہ ان اعمال بد کے ابدی انجام سے باخبر کیے بغیر) ان کے ظلم کی بناء پر دنیا میں عذاب نہیں دیا کرتا''۔

۲) وما کنا معذبین حتی نبعث رسولا (بنی اسرائیل ۱۵)

''یہ ہماری شان نہیں کہ ہم رسول کو مبعوث کئے بغیر اپنے بندوں کو عذاب دیں''۔ خاتم الانبیاء ہونے کے مستحق صرف وہی ہوسکیں گے جو نبیؐ کے اس کام کو کرنے میں مصروف ہیں، میلادالنبیؐ کے جلسے وجلوس یا سیرۃ النبیؐ کے جلسے کر دینے یا ایک آدھ مرتبہ یا چند دفعہ ابدی عذاب سے خبردار کرنے سے ذمہ داری ختم نہیں ہوتی کیونکہ نوحؑ نے ۹۵۰ سال تک ہر طرح سے اور نبی کریمؐ مکہ میں اپنے ہی رشتہ داروں، قبیلے اور حج کو آنے والے قبائل کو مسلسل ۱۳ سال تک خبردار کرتے رہے۔ ملحوظ رہے کہ تمام پیغمبروں کے خبردار کرنے کا طریقہ یتلوا علیھم ایٰتنا۔ ''ہماری آیتیں پڑھ پڑھ کر سنایا اور سمجھایا کرتے تھے''۔ رہا ہے

۳) وما کان اللہ لیعذبھم وانت فیھم (الانفال ۳۳)

''یہ اللہ کا طریقہ نہیں کہ جس جگہ پیغمبر موجود ہوں وہاں کے منکرین ومخالفین پر عذاب نازل کرے''۔ وما کان اللہ معذبھم وھم یستغفرون (الانفال ۳۳)

''یہ اللہ کی شان نہیں کہ ایسے لوگوں کو عذاب دے جو گناہوں سے بچنے کی کوشش کرتے ہوئے مغفرت کی دعائیں کرتے رہتے ہیں''۔

مفتی شکیل احمد رحمانی۔ سکندرآباد، حیدرآباد

مساجد سے وابستگی اسلام کا لازمی حصہ

اذا رائیتم الرجل یعتاد المسجد فأشهدوا له بالایمان جب تم کسی کو بکثرت مسجد میں آمد و رفت کرتے دیکھو تو اس کے مسلمان ہونے کی گواہی دو! کیونکہ اللہ جل شانہ کا ارشاد ہے کہ مسجدوں کو وہی لوگ آباد کرتے ہیں جو اللہ پر اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہیں رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں سارے کام مسجدوں سے ہی انجام پاتے تھے، یہ تعلیم گاہ بھی تھی مشورہ گاہ بھی عبادت کی جگہ بھی اور فیصلہ کا مقام بھی، یہاں سے مظلوموں کی دادرسی بھی کی جاتی تھی اور ظالموں کو ظلم سے روکا بھی جاتا تھا، یہیں سے اصلاح معاشرہ کا کام بھی انجام پاتا تھا، اور اللہ کے پیغام کو دور دراز تک پہنچانے کے منصوبے بھی بنائے جاتے تھے، نکاح کی تقریب بھی ہوتی تھی اور وظائف کی مجلسیں بھی سجتی تھیں آج ضرورت ہے کہ مساجد کے کردار کو پھر سے زندہ کیا جائے اور اسے تعلیمی، دعوتی اور سماج کی بے راہ روی دور کرنے والے ادارے اور مراکز کے طور پر استعمال کیا جائے، اللہ کے گھر سے وابستگی کا اندازہ اس بات سے لگائیے کہ سید حضرت آدم علیہ السلام جنت سے روئے زمین آئے تو سب سے پہلے بیت اللہ کی تعمیر کی طرف متوجہ ہوئے۔

اقبال کی زبان میں:۔ دنیا کے گھروں میں پہلا وہ گھر خدا کا ''ہم پاسباں ہیں اسکے وہ پاسباں ہمارا''

پھر طوفان نوح میں یہ تعمیر منہدم ہوگئی تو ملت اسلامیہ کے بانی حضرت ابراہیم علیہ السلام اور انکے فرزند ارجمند حضرت اسمعیل علیہ السلام کے ہاتھوں از سر نو بیت اللہ کی تعمیر ہوئی، اور رسول اللہ ﷺ کو جب اعلانیہ تبلیغ کا حکم ہوا تو آپ ﷺ نے بیت اللہ شریف کو اپنا مرکز بنایا پھر جب کفار کی طرف سے مخالفت ہوئی تو آپ ﷺ نے دارارقم کو اس کام کے لئے منتخب فرمایا پھر اسلام نے سرزمین عرب سے باہر قدم نکالا تو جہاں جہاں اسلام کی روشنی پہنچی مساجد تعمیر ہوتی چلی گئی، کیوں کہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان تھا ہر ہر محلّہ اور ہر ہر آبادی میں مساجد تعمیر کرو انہیں صاف ستھرا رکھو اور ان میں خوشبو بساؤ، اس لئے رسول اللہ ﷺ کو جب ہجرت کا حکم ہوا تو آپ ﷺ نے قبا میں چودہ دن قیام فرمایا دوران قیام رسول اللہ ﷺ نے جس چیز کی طرف سب سے پہلے توجہ فرمائی وہ مسجد کی تعمیر تھی اس مسجد کی تعمیر میں رسول اللہ ﷺ اینٹ، پتھر اور گارے اٹھا اٹھا کر لانے میں بنفس نفیس شریک رہے اس مسجد کی پاکیزگی اور یہاں کے باشندوں کے تقوی وطہارت کی شہادت میں خود قرآن گویا ہے، ''**لمسجد انس علی التقوی فیه رجال یحبون ان یتطهروا**'' جب مسجد قبا کی تعمیر مکمل ہوگئی تو آپ ﷺ مدینہ تشریف لے گئے وہاں بھی آپ ﷺ نے اپنی بود و باش اور قیام وطعام کی فکر کرنے کے بجائے سب سے پہلے مسجد کی تعمیر کی فکر فرمائی جس سے اسلام کا مسجد کے تلازم کو آسانی سے سمجھا جاسکتا حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ آپ ﷺ گھر کے کام کاج میں مشغول رہتے لیکن جیسے آذان کی آواز سنتے سب کچھ چھوڑ کر مسجد تشریف لے جاتے سفر سے واپسی ہوتی تو مسجد تشریف لے جاتے فقر وفاقہ کی نوبت آتی تو مسجد تشریف لے جاتے، خوف وگھبراہٹ یا پریشانی کا موقع ہوتا تو مسجد تشریف لے جاتے، سورج یا چاند گہن ہوتا تو مسجد تشریف لے جاتے مرض الوفات میں صرف تین یا چار دن مسجد نہ جاسکے، تو بے چین ہوگئے دو لوگوں کے سہارے مسجد تشریف لائے، اگلے روز اتنی بھی ہمت نہ تھی تو گھر سے پردہ اٹھا کر جھانکا اور مسلمانوں کو سر بسجود دیکھ کر چہرہ خوشی سے تمتما اٹھا اور ہر عمل

میں مسجد کی طرف رخ کرنے کی ترغیب دلائی۔

حضرت علیؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا آخری کلام یہ تھا" **الصلوٰۃ الصلوٰۃ واتقو اللہ فیما ملکت ایمانکم** " نماز، نماز اللہ سے اپنے ماتحتوں کے حقوق کے بارے میں ڈروچوں کہ نماز ایمان کے بعد افضل عبادت ہے اور ہر ہر فرد پر ایمان کے بعد نماز سب سے پہلا فریضہ ہے، جو شخص نماز کے لئے نہ آئے تو فقہاء ایسے شخص کے ایمان کا اعتبار نہیں کرتے، کیوں کہ نماز اسلام کے ان تمام عقائد کو تازہ کرتی ہے جن پر ایمان لائے بغیر نفس کی پاکیزگی اخلاق کی روشنی اور اعمال کی اصلاح ممکن نہیں صبر و توکل تقویٰ وطہارت نفس وغیرہ اعلیٰ اخلاقی اوصاف کے حاصل کرنے کا بہترین ذریعہ نماز ہے نماز کے اندر آدمی کو پاکباز اور خداترس انسان بنانے کی ہے، انتہا قوت موجود ہے نماز ہمیں باحوصلہ اور عالی ظرف بناتی ہے اور ایک پاک اور صاف وستھری زندگی کی طرف رہنمائی کرتی ہے نماز مومن کی زندگی کا اول وآخر سب کچھ ہے، نماز مومن کی اسلامی زندگی کی آئینہ دار ہے، اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے بینائی سے محروم لوگوں کو بھی مسجد کی حاضری سے مستثنیٰ نہیں فرمایا چنانچہ مسلم شریف کی روایت ہے کہ ایک نابینا صحابی حضرت عبداللہ بن ام مکتوم رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے اور آپ سے رخصت چاہی کہ اے اللہ کے رسول اللہ ﷺ میں نابینا ہوں مجھے گھر سے کوئی مسجد لانے والا نہیں ہے تو کیا میں گھر میں نماز پڑھ سکتا ہوں، رسول اللہ ﷺ نے دریافت فرمایا کیا تم اذان کی آواز سنتے ہو، انہوں کہا ہاں یا رسول اللہ ﷺ میں آواز سنتا ہوں تو آپ ﷺ نے فرمایا پھر مسجد میں آکر نماز پڑھو، غور کرنے کا مقام ہے؟ کہ جب ایک معذور آدمی کو مسجد چھوڑ کر گھر میں نماز پڑھنے کی اجازت نہیں مل رہی ہے تو جو لوگ تندرست و توانا ہوان کو مسجد چھوڑ کر گھر میں بیٹھ جانے اور گھر میں نماز پڑھنے کی اجازت کیسے مل سکتی ہے۔

ایک حدیث میں ہے کہ اگر عورتوں اور بچوں کا خیال نہ ہوتا تو میرا دل چاہتا ہے کہ چند جوانوں سے کہوں کہ وہ بہت سا ایندھن اکٹھا کر کے لائیں پھر میں ان لوگوں کے پاس جاؤں جو بلا عذر گھر میں نماز پڑھ لیتے ہیں اور جا کر ان کے گھروں کو جلادوں اور ایک حدیث میں ہے کہ جس نے اذان سنی اور نماز کے لئے شرعی عذر کے بغیر مسجد نہ گیا تو اسکی نماز ہی نہیں ہوتی ایک حدیث میں ہے کہ جس نے جماعت سے نماز پڑھنی چھوڑ دی اس نے نبی کا طریقہ چھوڑ دیا اور جس نے نبی ﷺ کا طریقہ چھوڑ شیا وہ گمراہ ہو گیا حضرت عبداللہ بن عبداللہ عمرؓ فرماتے ہیں کہ ہم صحابہ کے زمانہ میں منافقوں کی بھی ہمت نہ ہوتی کہ وہ جماعت کی نماز چھوڑ دے حتی کہ ہم میں سے جو شخص بیمار ہوتا وہ بھی دو آدمیوں کے کندھے پر ہاتھ رکھکر آتا اور نماز پڑھتا ایک حدیث میں ہے کہ منافقوں کو عشاء اور فجر کی نمازوں کا ثواب معلوم ہو جائے تو وہ مسجد میں گھٹنوں کے بل چل کر آئیں۔ غور کرنے کا مقام ہے کہ اگر آدمی مسجد چھوڑ کر گھر میں نماز پڑھ لے تو اسکی نماز کامل نہ ہوگی اور دوسری حدیث کے رو سے اسکے گمراہ ہو جانے اور تیسری حدیث کے رو سے اسکے منافق ہونے کا فیصلہ صادر کیا جارہا ہے اگر مسجد اسلام کا جزو لاینفک نہ ہوتی تو اتنی بڑی بات کیوں کر کہی جاتی نور علی نور رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے زمین میں سب سے محبوب جگہ اللہ کے نزدیک مسجدیں ہیں اور فرمایا قیامت کے دن سات لوگ عرش کے سایہ میں ہوں گے، ان میں ایک وہ شخص بھی ہے جس کا دل مسجد سے اٹکا رہتا ہے، ایک حدیث میں ہے کہ ملک الموت ہر نماز میں معائنہ کرتے ہیں جن لوگوں کو مساجد میں نماز پڑھنے کا پابند پاتے ہیں انہیں موت کے وقت کلمہ طیبہ تلقین کرتے ہیں اور اس کا خاتمہ ایمان پر ہوتا ہے۔

اور یہ حدیث تو مشہور ہے کہ جمعہ کے روز فرشتے مسجد کے دروازہ پر کھڑے ہو کر لوگوں کا نام لکھتے ہیں اور آنے والوں کا ترتیب وار زیادہ اور کم ثواب لکھتے ہیں، ایک روایت میں ہے کہ جس نے تین جمعہ چھوڑ دیا اس کے دل پر گمراہی کی مہر لگ جاتی ہے مسجدیں تعمیر کرنے کی ترغیب دی گئی اور مساجد سے وابستگی ختم کرنے پر اس طرح نکیر کی گئی ہے جس نے کوئی مسجد بنائی تو اللہ تعالیٰ اسکے لئے جنت میں ایک گھر بنائے گا، ارشاد ربانی ہے اس شخص سے بڑا ظالم کون ہوگا جو اللہ کے بندوں کو مسجد کی آمد و رفت سے روکے اور ان

میں خرابہ پھیلانے کی کوشش کرے، ایک حدیث میں ہے کہ قیامت کے دن تمام زمین ختم ہو جائیگی سوائے مسجدوں کے کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ ہو جائینگی۔

اس حدیث سے یہ بات معلوم ہوئی کہ مسجدیں قیامت تک مسجد ہی کی حیثیت سے باقی رہ جائینگی، مذکور بالا احادیث و آثار سے یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ مسجدیں اسلام کا لازمی جز ہے مساجد کے بغیر اسلام کا تصور ممکن نہیں ۔اسلام کی پوری تاریخ میں مساجد دین کے مراکز اور سیاست کے سینٹرز رہے ہیں، اس لئے مساجد کے متعلق عدالت کی یہ رائے کہ مساجد اسلام کا لازمی جز و نہیں ہے بعید از حقیقت ہے اور اسلام کی پوری تاریخ سے اعتماد کو ختم کرنے کی علامت ہے

سید معین الدین حسینی ہاشم ۔حیدرآباد

قرآن اور آج کا مسلمان

مایوس شفاء کو آسرا دیتے ہیں
آیات کو تعویز بنا دیتے ہیں

ہوشیار تو لیتے نہیں قرآں سے سبق
بیمار کو قرآں کی ہوا دیتے ہیں

غفلت جو کی گئی ہے خدا کی کتاب سے
درد اس کا پوچھو قلبِ رسالت مآب سے

بے اعتنائی ایسی کتابِ خدا سے ہے
جیسے کسی مریض کو نفرت دوا سے ہے

بیگانہ یوں ہیں جیسے کوئی واسطہ نہیں
قرآں کتاب ان کی ہے رب ان کا خدا نہیں

حق کی کتاب دفن ہے گردوغبار میں
گل کو کفن اڑھایا ہو جیسے بہار میں

پہونچے نہ ہاتھ ایسی بلندی پہ رکھ دیا
سایہ نہ پڑنے پائے کچھ ایسا جتن کیا

حق کی کتاب داخلِ محراب ہوگئی
لو آرزو سے دید بھی اب خواب ہوگئی

رکھی ہوئی ہے دوست کتابِ خدا جہاں
جالے کا مکڑیوں نے بنایا ہے گھر وہاں

دیکھا نہ جس نے بھولے سے قرآن کھول کر
سورے اسے پلاتے ہیں پانی میں گھول کر

بھائی بھتیجے بیٹی نہ بیٹے کے واسطے
قرآن وقف کردیا ہے بوسے کے واسطے

حفظِ انا کا اس کو وسیلہ بنا لیا
منوانے اپنی بات کو سر پر اٹھا لیا

آیاتِ قدس کو عوض مال وزر دیا
قرآن کو زہن مصرف تعویذ کردیا

داخل تو ہے جہیز میں مصرف کہیں نہیں
داماد بیٹی اس کو پڑھیں گے کبھی نہیں

حلق میں جان آئے تو مرشد بلایا جائے
باوا کا دم نکلے تو یٰسین پڑھا جائے

تسکینِ دردِ دل کے لیے بنا لیا
قرآن کو چومنے کی بس اک شئے بنا لیا

معنی سے کوئی ربط نہ مطلب سے کام ہے
تاریکیاں ہیں فکر میں ذہنوں میں شام ہے

مفلس نہ کیسے ذہنِ مسلماں ہو دوستو
جب مرکزِ حیات نہ ہو قرآن دوستو

قرآں بغیر پھیلے گا کیا نورِ زندگی
الماریوں میں بند ہے دستورِ زندگی

قرآں کے لفظ لفظ میں ہے کیفِ زندگی
یہ شاخِ گل کہیں ہے، کہیں سیفِ زندگی

قرآں نہیں دکھا دے کی تعظیم کے لیے
یہ ہے عمل کے واسطے تسلیم کے لیے

اس سے تو فیض اٹھایا ہے اقوامِ غیر نے
قرآں سے سبق لیا ہے بس اہلِ دیر نے

ہاشمؔ اسے نصیب سے کون ومکاں ملے
قرآں ملا جسے اسے دونوں جہاں ملے

ڈاکٹر رفیعہ شمیم۔حیدرآباد

اردو افسانہ اور محشر عابدی

ڈاکٹر محشر عابدی 1933 کے مقبول افسانہ نگاروں میں ممتاز مقام پر فائز تھے انہوں نے نہ تو بہت زیادہ لکھا اور نہ بہت کم، لیکن پھر بھی جتنا کچھ لکھا اسکے دو مجموعے شائع ہو چکے ہیں ان کے افسانوں میں ایک انفرادیت اور خصوصیت نظر آتی ہے انہوں نے افسانے کو نہ تو کلاسکی طرز میں محدود کر دیا نہ اسے اخلاق و نصیحت کی تبلیغ کا ذریعہ بنایا انکے اکثر افسانے انکے اپنے ذاتی تجربات عمیق مشاہدے اور وقائع پر مبنی ہیں انکی کہانیوں میں سماج کے تاریک گوشے بھی ہیں اور فرد کی شخصیت کی بھیانک شبیہہ بھی، جب فنکار ایک کے متعلق اپنی آگاہی اور دوسرے کیساتھ ہمدردی کا اظہار کرتا ہے تو ان دونوں صورتوں میں اسکا انداز نہایت لطیف اور اسلوب نہایت شگفتہ ہوتا ہے انکے شائع ہونے والے دو افسانوی مجموعے ''محشرستان'' اور ''مس'' میں وہ افسانے ہیں جس میں انہوں نے نہ صرف اپنے مشاہدات اور مطالعات کو افسانوں کا موضوع بنایا ہے بلکہ قصہ خوانی اور ماجرا سازی کا بھی حق ادا کیا ہے انکے افسانوں کا ایک اور وصف شستہ و رواں زباں بھی ہے ''محشرستان'' میں شگفتہ طرز بیان شروع ہی سے جھلکتا ہے۔ڈاکٹر محشر عابدی اپنے انداز کی بدولت اپنی انفرادیت قائم رکھنے میں انکے افسانوں میں مناسب الفاظ، موضوع کے لحاظ سے واقعیت، مناظر کی مصوری اور فضا بنانے میں انداز بیاں اور تحریر اور حسن بیان کا بڑا دخل ہوتا ہے۔

محشر عابدی فکری اعتبار سے رومانوی ہیں، ان کے ہاں محبت کا انسانی رشتوں کا جو تصور ہے وہ بڑی حد تک تخلیقی ہے، بلکہ ان کے عمیق مشاہدے سے افسانوں کے کردار کی تخلیق ذاتی تجربات کو افسانوی رنگ دینے کی کاوش اور ارد گرد پھیلی ہوئی زندگی سے موضوعات کا انتخاب وغیرہ پر روشنی پڑتی ہے۔

محشر عابدی کے افسانے زندگی کے کسی نہ کسی رخ پر روشنی ڈالتے ہیں اور اس کے اچھے اور برے پہلوؤں کو اجاگر کر کے انسانی زندگی کی بنیادی کمزوریوں کا جانب توجہ مبذول کراتے ہیں۔انہوں نے جہاں مثبت کردار پیش کیے وہیں منفی کردار بھی پیش کیے ہیں، ان کے افسانوں کا خاص وصف یہ بھی ہے کہ انہوں نے کرداروں کی نفسیات کا تجزیہ ان کی شخصیت کو سامنے رکھ کر کیا ہے وہ انسانی زندگی میں ہونے والے واقعات پر اپنی نگاہ مرکوز کیے ہوتے نظر آتے ہیں، ان کے تجربات پڑھنے والے کو ایک نئی جلا بخشتے ہیں، ان کے اسلوب میں تازگی کا احساس ہوتا ہے، ان کا حسن افسانے مقصدیت اور افادی ادب کی زندہ مثال ہے۔

محشرستان اور مس میں شامل افسانے اصلاحی نوعیت کے ہیں، ان میں ایثار اور ہمدردی، محبت و شفقت، جذبوں کا احترام اور اعلیٰ اخلاق کا سبق ملتا ہے، ان کے افسانے تعمیری نوعیت کے ہیں، انہوں نے سماجی اصلاحی کا کام اپنے افسانوں سے لیا ہے۔

محشر عابدی نے ''محشرستان'' کے بارہ افسانوں کو چار حصوں میں تقسیم کیا ہے اور ہر حصے میں تین افسانے

ہیں۔

زائرین فلک۔اصنام محبت۔کشتی حیات۔نقوش تخیل۔ فرشتے کی سیر۔شادی کی رات۔ستی۔تصویر کی زندگی۔ ادیب کی بیوی۔پرستار محبت۔نغمۂ پرست۔انتظار۔دوزخ کی سیر۔وعدہ شکنی۔سوبھا۔دوآنسو

مختلف موضوعات کے تحت یہ بارہ افسانے اپنے زمانے میں بہت مقبول ہوئے۔

محشرستان کے ''تیرہ'' سال بعد محشر عابدی نے انکا دوسرا افسانوی مجموعہ ''مِس'' 1946 میں شامل ہوا۔(۱)پناہ (۲)نرگس (۳)رشوت (۴)مس ایم۔بی۔بی۔ایس (۵)دلہن (۶)دوشیزہ (۷)فریب (۸)اچھوت کی لڑکی (۹)مانی۔

''مِس'' کے طبع زاد اور ترجمے دونوں قسم کے افسانوں کی خصوصیت رومانی تھی۔مترجمہ افسانوں میں صد فیصد کردار ماحول اور دیگر لوازم وغیرہ مقامی ہی تھے انہوں نے مغربی ومشرقی روایات کو اعتدال کی راہ اپناتے ہوئے اپنے افسانوں میں استعمال کیا کیوں کہ اعتدال پسندی ہی مشرقی روایات کی نمایاں خصوصیت ہے۔

ڈاکٹر محشر عابدی کے دو افسانوی مجموعے ''محشرستان'' اور ''مِس'' کے افسانوں کے موضوعات رومانی ،سماجی، معاشرتی اور اصلاحی ہیں۔ڈاکٹر محشر عابدی کے یہ دو افسانوی مجموعے جس میں قدرتی مناظر، فطرت کی عکاسی، درد کی کسک، خوشبو کی مہک، جوانی کا کرب، تاریخی مناظر سبھی کچھ ہیں۔

ڈاکٹر محشر عابدی اپنے انداز کی بدولت اپنی انفرادیت کو قائم کرتے ہیں۔انکے افسانوں میں مناسب الفاظ، انتخاب موضوع میں ندرت وجدت، مناظر کی مصوری اور فضا بنانے میں انداز بیاں اور تحریر اور حُسن بیاں کا بڑا دخل ہوتا ہے۔

افسانہ ''اچھوت کی لڑکی'' میں محشر عابدی نے طبقاتی کشمکش کو موضوع بنایا ہے۔اس میں انہوں نے ہنمنتا کو ایسے کردار میں پیش کیا ہے جو چٹانوں سے ٹکرانے کا حوصلہ رکھتا ہے جو نہ صرف سماج بلکہ گھر والوں کے ظلم کے خلاف آواز بلند کرتا ہے۔ پامردی کیساتھ حالات کا مقابلہ کرتا ہے فہم اور دانشمندی کیساتھ مسائل سے نمٹتا ہے اور انسانیت کا ثبوت دیتا ہے۔

درج ذیل اقتباس بطور ثبوت پیش ہے۔

''ہری ہر مکرجی نے دروازے کے قریب پہنچ کر کہا بس بہت وقت ہو چکا ہے اب میں زیادہ وقت نہیں دے سکتا، اس لڑکی کو فوراً گھر سے باہر نکالدو۔

جب کُسم نے یہ آواز سنی تو پورے جوش اور جذبات کے ساتھ ہنمنتا کے پیروں سے چمٹ گئی انکو پیار کیا اور تعظیماً اپنی پیشانی ان پر رکھدی اور پھر کھڑی ہوگئی۔

ہنمنتا اٹھا اور دروازہ کی طرف بڑھ کر بولا

''اباجان میں اپنی بیوی کو نہ چھوڑونگا''۔کیا کہا! اسکے والد نے چیخ کر پوچھا'' کیا تو اپنی ذات کو چھوڑ دیگا؟''

میں اپنی ذات کی پرواہ نہیں کرتا مجھے انسانیت کا خیال ہے''۔ہنمنتا نے سنجیدگی سے جواب دیا''۔ ؎

اس افسانے کے مطالعہ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ہنمنتا کی سچی محبت، مذہبی قید سماج کے قواعد اور اصولوں کو توڑ دیتی ہیں اور انسانیت سب پر غالب آتی ہے۔

دل کے تاروں کو جھنجھوڑ کر رکھ دینے والی ایک ایسی کہانی جو انسانوں کی بیدردی، بیرحمی، اور ناقدری سے ایک ادیب اور اسکے گھر والوں کو کس طرح مصائب کا سامنا کرنا پڑتا ہے اس کی تصویر کشی بڑی ہی اثر آفرینی کے ساتھ پیش کی گئی ہے ''ادیب کی بیوی'' میں معاشی جذباتی مسائل کو موضوع بحث لایا گیا ہے اس میں ایک ایسے کردار کو پیش کیا ہے جو ایک طرف انسانی مظالم کا شکار ہے تو دوسری طرف

خرابیٔ قسمت سے پریشان، لاکھ تدابیر اور حکمت عملی اختیار کرنے کے باوجود ناکامی اور مایوسی کے دلدل میں پھنستا چلا جاتا ہے، انسان کسی انسان کا خون کرے کیوں؟ تو ہے قاتل بھی انسان مقتول بھی انسان! آخر کوئی خونی کا مقتولوں کیساتھ کوئی رشتہ نہیں، مگر انسانی رشتہ ایک طرح یہ بھی انسانی رشتوں کی عکاسی کرنے والا افسانہ ہے اس کا پلاٹ مربوط ہے اور کہانی میں تسلسل برقرار ہے تاہم ڈاکٹر محشر عابدی نے سنسنی خیز اختتام کے ذریعہ کہانی میں گہرا تاثر پیش کیا ہے۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔

''آفتاب کی کرنیں اس غربت کدے پر پڑ رہی تھیں۔ دروازے پر متعدد آدمیوں کا ہجوم تھا ان میں ایک وہ ایڈیٹر تھا جس نے رات کو خط بھیجا تھا اور اس وقت رشید سے افسانہ لینے اور اسکا معاوضہ ادا کرنے آیا تھا۔ اس مجمع میں رشید کے عزیز ترین دوست کا ملازم بھی تھا جو رشید کی خاطر ایک نوٹ لایا تھا جو اسکے دوست نے ہوش میں آنے کے بعد خط پڑھ کر روانہ کیا تھا اس میں ناظم کتب فروش کا چپراسی بھی تھا جس کے ذمے رشید کا بقایا تھا اور جو اسے یہ بقایا دینے کو بلانے آیا تھا اس میں ایک ایسا ایڈیٹر بھی تھا جس پر رشید کی علمیت اور قابلیت منکشف ہو چکی تھی اور جو اب رشید کی مستقل خدمات حاصل کرنے آیا تھا اور وہ دو سو روپیہ ماہانہ دینے کا ارادہ رکھتا تھا۔

آخر کار دروازہ توڑا گیا سب لوگ اندر داخل ہوئے انہوں نے سب سے پہلے جو دلخراش منظر دیکھا وہ ان دو بے حس و حرکت انسانوں کی نعشیں تھیں جس میں ایک آفاتِ آسمانی کی آماجگاہ بنا تھا اور دوسرا انسانی مظالم، بیدردی، بے حسی اور بیرحمی کا شکار، یہ قلب شکن نظارہ دیکھ کر سب کے دل بھر آئے اور بعض رونے لگے۔ ایڈیٹر نے تخت پر پڑا ہوا کاغذ اٹھالیا اور بلند آواز میں پڑھنے لگا ''ایک ادیب کی بیوی''..... ۸

اس افسانے کا جائزہ لینے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ محشر عابدی نے راحت و آسائش سے محروم ادیب کے جذبات، کشمکش، حیات و احساسات کو پیش کیا ہے جن کا تعلق حقائق زندگی سے ہے اور اس کائنات میں زندگی بسر کرنے والے فرد کے داخلی کرب کو پیش کیا ہے۔

''نغمہ پرست'' میں ڈاکٹر محشر عابدی نے نسوانی کردار کی بیمثال قربانی کو موضوع بنایا ہے جب یہ دل مچلتا ہے اور کسی کی چاہت اور محبت کو اپنے اندر جگہ دیتا ہے تو ایک زمانہ کو اپنے اندر سمیٹ لیتا ہے دِل عاشق کی گہرائی اور گیرائی کو وہی سمجھ سکتے ہیں جو عشق کی پاکیزگی اور عزت نفس کی باریکیوں کا ادراک کر سکتے ہیں اس میں کردار کی پاکیزگی اپنے عروج پر نظر آتی ہے ذیل کے اقتباس میں اس کی عکاسی کی گئی ہے۔

''خوشبودار پھولوں سے کمرہ معطر ہو گیا مسہری پر کمخواب اور زریفت کا زرین بچھونا تھا اور اس پر حسین روپ متی لیٹی ہوئی تھی اسکے چہرے پر ریشم کا ایک باریک نقاب پڑا تھا اور اس کے حسن کی تجلیاں نقاب سے چھن چھن کر سارے کمرے کو بقعۂ نور بنائے ہوئے تھیں اور اس پر رنگین فانوس اور شمع کی روشنیاں جھلملا جھلملا کر اپنی گلابی اور سنہری کرنوں سے نور برسا رہی تھیں۔

آدم خاں مسہری کے قریب پہنچ گیا اور پُر ارمان نگاہوں سے روپ متی کو دیکھنے لگا وہ خوش ہو گیا، روپ متی کے پھول سے چہرہ پر تبسم کی چمک تھی اور اس کے نازک لب گلگوں، مسکراہٹ کے انداز سے بند تھے لیکن وہ کسقدر خاموش تھی۔؟ خاموش اور خود فراموش چپ اور انتہائی سکوت میں گُم صُم۔

اسنے آہ سرد بھر کر کہا ''پیاری حسین خاتون'' اور آگے بڑھکر اسکا ہاتھ پکڑ لیا جو چادر کے اوپر رکھا ہوا تھا لیکن وہ سرد تھا۔ سرد اور بلکل سرد۔ وہ بیقرار ہو کر چلا اٹھا اور اپنا

ہاتھ اس کے سینہ پر رکھا لیکن اسمیں کوئی حرکت نہ تھی۔ گھبرایا اور وحشت زدہ کمرے سے باہر آیا۔ اور روپ متی سوتی رہی۔ وفا شعاری کی نیند میں کھوئی ہوئی محبت کے خواب میں گم۔ گہری اور ابدی نیند۔ زہر پہلے ہی کامل طور پر اپنا اثر کر چکا تھا''۔ ۹

اس افسانے میں محشر عابدی نے عورت کی وفا شعاری کو نکتہ بنا کر پیش کیا ہے۔

افسانہ ''تصویر کی زندگی'' میں ''لالچ'' کو موضوع بنایا گیا ہے اسمیں مصور کے پرستانہ جذبات اور شہرت کے جذبہ کی اچھی تصویر کشی کی گئی ہے۔ اس کا پلاٹ کچھ یوں ہے۔

مصور ناظورۂ جمال کو پا کر ساری دنیا کو فراموش کر دیتا ہے اس کی راحت و آسائش کیلئے ایک خوبصورت گھر دامن کوہ میں جھیل کے کنارے تعمیر کراتا ہے خوبصورت باغ، فوارے، نہریں، پرندے غرض کے ہر قسم کی دلچسپی کا سامان مہیا کرتا ہے اور مصور اس سے کبھی ختم نہ ہونے والی داستان بیان کرتا اور دونوں صبح اور شام تفریح میں مصروف ہو جاتے کہانی میں کئی نشیب و فراز آتے ہیں۔

زمانے نے رنگ بدلا اور ساتھ ہی مصور کی زندگی نے بھی، اسکے پرستش حسن میں انحطاط پیدا ہوتا گیا اور اس کی وہ تمام دلچسپیاں ناظورۂ جمال سے تھیں منقود ہوتی گئیں غیر دلچسپ اور غیر موثر ہستی نظر آنے لگی، اب وہ ناظورہ کی راحت و آسائش کا خیال نہ کرتا تھا بلکہ اپنی عشرتوں کو اس پر ترجیح دینے لگا تھا۔ ناظورہ مصور کی بے حسی اور بے اعتنائی پر آنسو بہاتی غرض مصور وہ مصور نہ رہا تھا جو ناظورۂ جمال کو اپنی حیات کا سرمایہ تصور کرتا تھا محض اس لئے کہ اس کی مختلف تصویریں بنا کر فن کی شہرت حاصل کرے اور نام کی شہرت حُسن پرستی پر غالب آ گئی ایک اقتباس بطور ثبوت پیش ہے۔

''مصور نے سوچا کہ ایسی نادر روزگار تصویر بنائے جس کی مثال دنیا نے اب تک نہ پیش کی ہو اس خیال کے آتے ہی اسے وہ دوشیزہ یاد آ گئی جو جھیل کے کنارے نظر آئی تھی اور جو اب ناظورۂ جمال کے پیکر میں منتقل ہو چکی تھی۔ اس نے سوچ لیا کہ ویسی ہی تصویر بنائے جیسی پہلے بنائی تھی اور اسکے لئے اسنے ناظورہ کو منتخب کیا۔

رات بھر مصور اس خیال میں سرگرداں رہا۔ رات جوں توں کٹی صبح ہوتے ہی وہ بستر سے اٹھا اور ناظورہ کی خوابگاہ کی طرف گیا۔ وہاں جا کر اس نے ناظورہ کو نہ پایا تو اسے دیکھنے کے باغ میں گیا جہاں وہ اکثر تفریح کیا کرتی تھی لیکن وہ وہاں بھی نہ تھی اب مصور کسی قدر پریشان ہو گیا اسے تلاش کرنے کی آخری جگہ پہاڑ کا دامن اور جھیل کا کنارہ تھی۔ وہ بیتابانہ وہاں سے جھیل کی طرف روانہ ہوا۔ اس کی رفتار تیز ہو گئی اور آخر کار وہ دوڑنے لگا اور جھیل کے کنارے پہنچ گیا۔ اس نے دیکھا کہ ناظورہ جھیل کے کنارے ایک بڑے پتھر کے قریب کھڑی ہوئی ہے، وہ بے تحاشہ اس کی طرف دوڑا اور جب اس پتھر کے قریب پہنچا تو ناظورہ جمال غائب ہو گئی وہ اسے دیکھنے کی کوشش کی لیکن نظر نہ آئی البتہ وہ پتھر پر جلی حروف میں چند الفاظ دیکھ کر جھجکا پھر اس تحریر کے قریب گیا اور اس کو پڑھنے لگا جو حسب ذیل تھی۔

''انسان اپنی مطلوبہ شئے کو پا کر اسکی اہمیت کو بھول جاتا ہے اور جب وہ اس سے چھین لی جاتی ہے تو کف افسوس ملنے سے کوئی نتیجہ نہیں نکلتا''۔ ۱۰

مصور یہ پڑھ کر بیٹھ گیا اور اس تحریر سے سر ٹکرانے لگا۔

اس افسانہ میں یہ نکتہ بیان کیا گیا ہے کہ انسان کو جب اپنی مطلوبہ چیز حاصل ہوتی ہے تو اس کی قدر کرنی چاہیئے ورنہ پچھتانا پڑیگا۔

مفتی امانت علی قاسمی استاذ دارالعلوم حیدرآباد

بیت المقدس مسلمانوں کی مذہبی میراث ہے

اس روئے زمین پر اللہ کا پہلا گھر خانہ کعبہ ہے اور دوسرا خانہ خدا، مسجد اقصی ہے، ایک روایت میں ہے حضور ﷺ سے سوال کیا گیا یارسول اللہ سب سے پہلی مسجد کون سی ہے آپ نے ارشاد فرمایا مسجد حرام، سوال ہوا اور دوسری؟ آپ ﷺ نے فرمایا مسجد اقصی، پوچھا گیا ان دونوں کے درمیان کتنا فاصلہ ہے، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا چالیس سال کا، یہ مسئلہ علماء کے درمیان اختلافی ہے کہ مسجد حرام کی تعمیر سب سے پہلے کس نے کی، ایک روایت ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام نے، اور ایک روایت یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اسی طرح اس میں بھی اختلاف ہے کہ مسجد اقصی کی تعمیر سب سے پہلے کس نے کی ہے ایک قول ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے اور دوسری روایت ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے لیکن زیادہ صحیح یہ ہے خانہ کعبہ کی تعمیر حضرت ابراہیم نے اور بیت المقدس کی تعمیر حضرت یعقوب علیہ السلام نے کی ہے اس لئے کہ ان دونوں کی عمر میں چالیس کا فاصلہ ہے، جبکہ حضرت ابراہیم اور حضرت سلیمان کی عمر میں کئی سو سال کا فاصلہ ہے۔

اسلام کے ابتدائی زمانہ میں آپ ﷺ بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے تھے مکہ میں تیرہ سال اور مدینہ ہجرت کرنے کے بعد سولہ یا سترہ مہینہ آپ ﷺ نے بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھی ہے اس لئے مسجد اقصی مسلمانوں کا قبلہ اول ہے، جس طرح مسجد حرام میں نماز پڑھنے کی فضیلت ہے اسی طرح مسجد اقصی میں نماز پڑھنے کی فضیلت ہے، مسجد حرام کی بنسبت مسجد اقصی میں ایک چوتھائی ثواب ملتا ہے، ایک روایت میں ہے مسجد حرام میں نماز پڑھنے کا ثواب ایک ہزار نمازوں کا ملتا ہے اور مسجد اقصی میں ڈھائی سو نماز پڑھنے کا ثواب ملتا ہے، یہ وہ جگہ ہے جہاں آپ ﷺ نے انبیاء کی امامت فرمائی ہے، سفر معراج کی پہلی منزل بیت المقدس ہے بعض روایت میں ہے کہ معراج پر تشریف لے جاتے وقت ہی آپ نے انبیاء کی امامت فرمائی تھی جبکہ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ معراج سے واپسی پر آپ ﷺ نے بیت المقدس میں فجر کی نماز میں انبیاء کی امامت فرمائی، ایک حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ عبادت کی نیت سے کسی مسجد کا سفر کرنا درست نہیں ہے سوائے تین مساجد کے مسجد حرام، مسجد نبوی، اور مسجد اقصی، یہ وہ وجوہات ہیں جن کی بنیاد پر بیت المقدس سے مسلمانوں کا رشتہ ایمانی اور مذہبی ہے، آپ ﷺ نے پیش گوئی فرمائی تھی کہ مسلمان بیت المقدس کو فتح کر لیں گے آپ ﷺ کی پیش گوئی بہت جلد پوری ہوگئی اور ۱۴ء میں حضرت عمر فاروقؓ کے زمانے میں حضرت عبیدہ بن الجراحؓ نے لشکر کشی کی اور فلسطین کا محاصرہ کر لیا اس وقت اس کا نام ایلیا تھا چالیس روز کے محاصرے کے بعد فلسطینی مصالحت کے لئے تیار ہوگئے، لیکن ان کی شرط تھی کہ مصالحت پر دستخط مسلمانوں کے خلیفہ خود آکر کریں حضرت عمر فاروقؓ نے صحابہ سے مشورہ کیا اور فلسطین تشریف لے آئے اور معاہدہ پر دستخط فرمادئے جس کی رو سے بیت المقدس پر مسلمانوں کا قبضہ ہوگیا، اور فلسطینی جزیہ دے کر مسلمانوں کے زیر سایہ رہنے لگے، ایک زمانے تک بیت المقدس مسلمانوں کے قبضہ

میں رہا، پانچویں صدی ہجری میں سلجوقی حکومت کا فاطمی حکومت سے مقابلہ ہوا اور فاطمیوں نے ان سے بیت المقدس اپنی تحویل میں لے لیا اس کے بعد ۴۹۳ھ میں پہلی صلیبی جنگ ہوئی اور بیت المقدس صلیبیوں کے ہاتھ میں چلا گیا اس کی بازیابی کے لئے اللہ تعالی نے سلطان صلاح الدین ایوبی کو پیدا فرمایا، صلاح الدین ایوبی یہ دیکھ کر کہ جس بیت المقدس کے ساتھ مسلمانوں کا والہانہ رشتہ رہا ہے آج وہ غیروں کے ہاتھوں میں ہے وہ تڑپ جاتے ہیں ان آنکھیں نم ہوجاتی ہیں، ان کے چہروں پر ہمیشہ غم کے آثار رہتے ہیں بالاخر وہ ایک مضبوط فوج تیار کر کے بیت المقدس کی بازیابی کا عزم مصمم کر لیتے اور سلطان کے عزم و استقلال کے آگے صلیبی فوجیں ڈھیر ہوجاتی ہیں، مقابلہ تو خوب ہوتا ہے مسلمان بڑی تعداد میں شہید ہوتے ہیں عیسائی بیت المقدس کے ارد گرد بہت مضبوط قلعہ تعمیر کرتے ہیں جسے عبور کر پانا بہت مشکل ہوتا ہے، لیکن ایوبی کی ہمت اور عزیمت کے آگے مضبوط قلعہ مسمار ہوجاتا ہے اور نوے سال کے عرصے کے بعد ۵۸۳ھ میں بیت المقدس پر دوبارہ اسلامی پرچم لہرانے لگتا ہے۔

حضرت عمر فاروق نے بیت المقدس کے فتح ہونے کے بعد وہاں ایک مصلی تعمیر کروایا تھا، پھر اموی خلیفہ عبد الملک بن مروان نے اس سادہ مصلی کو از سر نو تعمیر کرایا اور اس کے شمالی جانب میں ایک قبہ بھی تعمیر کرنے کا حکم دیا، لیکن ان کی زندگی نے وفا نہ کی اور یہ کام ان کے ہاتھوں تکمیل کو نہ پہنچ سکا پھر ان کے بیٹے ولید بن عبد الملک نے المصلی الجامع اور قبۃ الصخرا کو عالی شان انداز میں تعمیر کیا یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ بیت المقدس ایک بہت بڑے احاطہ کا نام ہے جس کی چاروں طرف سے مضبوط دیواروں کے ذریعہ گھیرا بندی کی گئی ہے اور یہ حصہ غیر مسقف ہے اس میں المصلی الجامع اور قبۃ الصخرا کے علاوہ اور بھی چیزیں تعمیر کی گئی ہیں اور ہر دور میں مسلم حکمرانوں نے مسجد حرام کی طرح بیت المقدس کی تعمیر و تزئین کاری کے ذریعہ فن تعمیر کی عظیم شاہ کاری کا مظاہرا کیا ہے آج کل جو بیت المقدس کی تصویر دکھائی دیتی ہے وہ درحقیقت قبۃ الصخرا کی تصویر ہے بیت المقدس تو بہت بڑے رقبہ پر پھیلا ہوا ہے۔

یہودیوں کے سلسلہ میں اتنا کہ دینا کافی ہے اسلام کے ابتدائی زمانہ سے وہ مسلمانوں کے بدترین دشمن ہیں انہوں نے عہد نبوی میں بد عہدی کی اس کے علاوہ اسلام کو جس طرح نقصان پہنچا سکتے تھے اس سے دریغ نہیں کیا قرآن نے ان کی عداوت و دشمنی کے سلسلے مختلف آیتیں نازل کی ہیں یہودی فلسطین

علینا عترت۔ غازی آباد (یوپی)

غزل

ہر اک ورق نمایاں ہر ایک باب میں ہم
تھے حاشیہ کی طرح پھر بھی اس کتاب میں ہم

جواب ہم تھے، ہمارے لیے جواب نہ تھے
سوال میں تو تھے شامل، نہ تھے جواب میں ہم

کوئی ملا ہی نہیں جس سے حال دل کہتے
ملا تو رہ گئے لفظوں کے انتخاب میں ہم

کسی نے خواب میں دیکھا ہمیں تو خواب کیا
کہ عمر بھر کو ہوئے قید ایک خواب میں ہم

عیاں تھے جذبۂ دل اور بیاں تھے سارے خیال
کوئی بھی پردہ نہ تھا جب کے تھے حجاب میں ہم

علینا تجربے ہیں تلخ اس کے مکتب کے
تو اور امتحاں دیں گے نہ اس نصاب میں ہم

پر اپنا حق مانتے ہیں اور بیت المقدس کی جگہ پر ہیکل سلیمانی تعمیر کرنا چاہتے ہیں، اسلام سے قبل یہودی فلسطین میں آباد تھے لیکن ۱۳۵ء میں رومی شہنشاہ ہیڈریان نے یہودیوں کو فلسطین سے جلاوطن کردیا تھا ۱۸۰۰ برس تک یہودیوں کو یہاں آباد ہونے کی اجازت نہیں تھی اس مدت میں صرف نوے سال تک بیت المقدس عیسائیوں کے قبضہ میں رہا، سب سے پہلی مرتبہ ۱۸۸۰ء میں کچھ یہودی خاندان فلسطین میں آکر آباد ہوئے پھر ۱۸۹۷ء میں یہودی تحریک معرض وجود میں آئی جس کا مقصد فلسطین پر قبضہ کرنا اور ہیکل سلیمانی تعمیر کرنا تھا، ۱۹۰۱ء میں ہرٹزل نے ترکی خلیفہ سلطان عبدالحمید کو لالچ دیا اس وقت فلسطین خلافت عثمانیہ کی ماتحتی میں تھا ،کہ آپ فلسطین میں یہودیوں کے مملکت کے قیام کی اجازت دے دیجئے، یہودی ترکی کا سارا قرضہ چکادیں گے، لیکن سلطان عبدالحمید نے نہ صرف ان کے پیش کش کو ٹھوکرا دیا دیا بلکہ ان کی غیرت ایمانی جوش میں آگئی انہوں نے کہا ہم اس وطن کی ایک بالشت زمین بھی اس وقت تک نہیں دیں گے جب تک کہ اس پر ہمارا خون نہ بہ جائے ، یہودی اس بات پر سلطان کے مخالف ہوگئے اور ۱۹۰۸ء میں سازش کے ذریعہ ان کو معزول کر دیا گیا ۱۹۱۴ء میں جب پہلی جنگ عظیم برپا ہوئی تو برطانیہ نے دوقومی نظریہ کے ذریعہ تحت عربوں اور ترکوں میں منافرت پیدا کردی اور عرب برطانیہ کے اور ترکی جرمنی کی حلیف ہوگئے ،اس دوران وائزمین نامی ایک یہودی نے برطانیہ کو یہ پیش کش کی کہ اگر جرمنی پر فتح کی صورت میں فلسطین میں یہودیوں کا قومی وطن بنا دیا جائے تو یہودی اس جنگ کا سارا خرچہ برداشت کرنے کو تیار ہیں، اور ۱۹۱۷ء میں یہ خفیہ معاہدہ ہوگیا جسے تاریخ میں اعلان بالفور کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، یہ معاہدہ برطانیہ کے دھوکے بازی اور بربریت کا عملی ثبوت ہے اور یہ وہ بدنما داغ ہے جسے انگریز کبھی دھو نہیں سکتے اس لئے کہ عربوں کی زمین انگریزوں کو فیصلہ کرنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا ہے پھر وہ انگریز شریف مکہ سے بھی وعدہ کرچکے تھے کہ عرب کی زمین پر عرب کی حکومت ہوگی اسی معاہدے کی وجہ سے شریف مکہ نے ترکی کے خلاف بغاوت کی تھی ،جس کی وجہ سے فلسطین اور عراق پر برطانیہ کا قبضہ ہوا تھا لیکن مسلمانوں سے کیا گیا وعدہ نظر انداز کرکے فلسطین یہودیوں کو دے دیا گیا ۱۹۱۷ء میں فلسطین کی یہودی آبادی چھپن ہزار تھی ،لیکن اعلان بالفور پر عمل ہونے کی وجہ سے ۱۹۲۱ء میں یہودی آبادی ۸۳ ہزار پہنچ گئی اور بڑی تیزی سے یہودی آباد ہونے لگے ۱۹۲۲ء سے ۱۹۴۷ء کا زمانہ برطانوی انتداب کا زمانہ ہے جس میں یہودیوں کو بسانے کا کام منظم طور پر کیا جاتا ہے اور فلسطین کی زمین خریدنے کے لئے خزانے کے منھ کھول دئے جاتے ہیں اب یہودیوں کی آبادی چار لاکھ سے تجاوز کرجاتی ہے ۱۹۴۷ء میں برطانیہ نے مسئلہ فلسطین کو اقوام متحدہ میں پیش کردیا اور اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے فلسطین کو عربوں اور یہودیوں کے درمیان تقسیم کردیا، اور فلسطین کا پچپن فیصد رقبہ یہودیوں کو اور پینتالیس فیصد رقبہ عربوں کو دے دیا یہ تقسیم بالکل ظالمانہ تھی کہ عربوں کی زمین بلا کسی وجہ کے زبردستی یہودیوں کو دے دی گئی تھی، اس لئے عرب اس تقسیم سے راضی نہیں تھے، لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ یہودی بھی اس تقسیم سے راضی نہیں ہوئے چنانچہ انہوں نے لڑائی کے ذریعہ عرب کی باقی زمینوں پر قبضہ کرنا شروع دیا ۱۴ مئی ۱۹۴۸ء کو یہودیوں نے اپنے قومی وطن اسرائیل کا اعلان کر دیا جسے امریکہ اور برطانیہ نے سب سے پہلے تسلیم کرلیا، اس وقت عرب ممالک نے اس تقسیم کی مخالفت کی اور کوششیں کی لیکن یہودی جارحیت کے سامنے عربوں کی ایک نہ چلی بالآخر ۱۹۶۷ء میں عرب اسرائیل جنگ کے نتیجہ میں بیت المقدس مسلمانوں کے ہاتھوں سے نکل گیا، بلکہ انہوں نے بیت المقدس کے علاوہ مصر کے صحرائے سیناء اور شام کے جولان کی پہاڑیوں پر بھی اپنا قبضہ جما لیا، اس طرح تیرہ سو سال جو بیت المقدس مسلمانوں کے قبضہ میں تھا یہودیوں کا اس پر قبضہ ہوگیا۔

اب ان کا منصوبہ یہ ہے بیت المقدس کو منہدم کرکے ایک عظیم ہیکل سلیمانی وہاں پر تعمیر کی جائے اس کے لئے وہ

منصوبہ بند کوششیں کررہے ہیں، کبھی اس کے ارد گرد کھدائی کرتے ہیں، سرنگیں بناتے ہیں، تاکہ بیت المقدس کی بنیادوں کو کھوکلا کیا جاسکے، بیت المقدس میں موجود قبروں کے نشان یا اس کے اسلامی نشان کو مٹا رہے ہیں، اس شہر سے اسلام کے نشان کو مٹانے کے لئے مسجدوں کو مسمار کر رہے ہیں، وہاں موجود مسلمانوں کو جبر وتشدد کے ذریعہ فلسطین چھوڑنے پر مجبور کیا جاتا ہے کبھی بیت المقدس میں آگ لگادی جاتی ہے گویا ہر طرح بیت المقدس کو نیست ونابود کرنے کی کوشش کی جارہی ہے، لیکن قربان جایئے فلسطینی مسلمانوں پر کہ بے سروسامانی کے عالم میں اپنے حقوق کے لئے لڑ رہے ہیں، اپنی ہمت کا مظاہرہ کررہے ہیں، نوجوان اور بچے بھی اس جنگ میں پیچھے نہیں ہیں، اپنی جان کی بازی لگا کر بیت المقدس کی بازیابی کی جدوجہد کررہے ہیں۔

اسلام نے دنیا کے تمام مسلمانوں کو ایک جسم کی طرح قرار دیا ہے اگر جسم کے کسی حصے کو تکلیف ہوتی ہے تو پورا جسم تکلیف محسوس کرتا ہے اسی طرح اگر دنیا کے کسی خطے میں مسلمان تکلیف میں ہوں تو ہندوستانی مسلمانوں کو بھی وہ تکلیف محسوس ہونی چاہئے، اگر فلسطین کے مسلمان اسرائیلی جارحیت کے شکار ہیں تو ہندوستانی مسلمانوں کو اس کے خلاف دستوری جد جہد کرنی چاہئے اور اپنے ایمان ویقین کا ثبوت پیش کرنا چاہئے، ہمیں مسئلہ فلسطین کا مطالعہ کرنا چاہئے، ہماری نوجوان نسل شاید اس پورے قضیہ سے ہی نابلد ہے، ضرورت اس ہے کہ ہم تاریخ کا مطالعہ کریں، حالات سے واقفیت حاصل کریں ،فلسطینی مسلمانوں کے ساتھ اگر کچھ نہیں کرسکتے تو کم از کم ان کے ساتھ اظہار ہمدردی وغم خواری کا معاملہ ضرور کرسکتے ہیں اتنا تو ہمارا حق ضرور بنتا ہے ان نہتے، جانباز فلسطینیوں کے لئے، اللہ تعالیٰ فلسطینی مسلمانوں کی مدد فرمائے اور کوئی صلاح الدین پیدا کرے جو مسلمانوں کی مذہبی میراث کو واپس دلاسکے فلسطین مسلمانوں کی مذہبی میراث ہے مسلمان کبھی بھی اور کسی صورت میں اس سے دست بردار نہیں ہوسکتے ہیں۔

رہبرؔ پرتاپ گڑھی۔اتر پردیش

غزل

منزل قریب آگئی منظر بدل کے دیکھ
باہر تو سب عیاں ہے تو اندر بدل کے دیکھ

خوشیوں کی آرزو ہے تو محنت بھی خوب کر
اپنے عمل کا آج سے دفتر بدل کے دیکھ

سچائی صاف صاف نظر آئے گی تجھے
آنکھوں کے اپنے چشمے کا نمبر بدل کے دیکھ

نصرت خدا کی آئے گی میداں میں تو اُتر
لشکر تو ہی قائدِ لشکر بدل کے دیکھ

پرواز تیری اپنی ہو شاہین کی طرح
اونچائیوں کا اور بھی منظر بدل کے دیکھ

جینے کا یہ ہنر ہے کہ لکھ اپنے ہاتھ سے
رہبرؔ تو خود ہی اپنا مقدر بدل کے دیکھ

مولانا افتخار رحمانی۔ نئی دہلی

منصورِ ہند صوفی سرمد شہیدؒ:
کتابِ زیست کے چند گم شدہ اوراق

اس حلفِ عشق کے بعد وہ خود دہلی کے کوچہ وگلی کا اسیر بن کر رہ گیا، کیوں کہ اس نے ٹھان لیا تھا کہ ہنشیں! اگر او خدا است خودمی آید اس قیام کے دنوں اس کی ذات سے بہت بڑی غلطی یہ ہوئی کہ وہ شاہجہاں کے فرزند دارا شکوہ جو طبعی طور پر صوفیوں اور ولیوں سے تعلق خاطر رکھتا تھا؛ بلکہ سرمد سے بڑی محبت بھی کرتا تھا، کا ہم نوا ہوگیا اور سلطنت و بادشاہت کی دعا دے بیٹھا۔ مولانا آزاد علیہ الرحمہ دارا شکوہ کے احوال لکھتے ہوئے دارا شکوہ کو سوز طلبی کا ایک متلاشی انسان قرار دیا ہے، ایک ایسا انسان کہ جس کو 'تلاش سوزِ طلبی' میں دیر وحرم کی تمیز بھی تھی، مولانا آزاد لکھتے ہیں:

''یہ وہ زمانہ تھا کہ عنقریب بساط ہند پر عالم گیرؒ ایک نئی چال چلنے والا تھا اور شاہ جہانی حکومت کا عہد آخری اور شاہزادہ دارا شکوہ ولی عہد سلطنت تھا۔ سلسلۂ مغلیہ میں دارشکوہ ایک عجیب طبیعت و دماغ کا شخص گزرا ہے۔ اور ہمیشہ افسوس کرنا چاہیے کہ تاریخ ہند کے قلم پر، کہ اس کے دشمن کا قبضہ رہا؛ اس لیے اصلی تصویر 'پولیٹکل چالوں' کے گرد وغبار میں چھپ گئی، وہ ابتداء سے درویش داشت اور صوفیانہ دل و ماغ کا شخص تھا اور ہمیشہ فقراء اور ارباب تصوف کی صحبت میں رہتا تھا، اس کے متعلق بعض تحریرات جو دست بردِ حوادث سے بچ گئی ہیں، بتلاتی ہیں کہ ان کا لکھنے والا بھی ذوق و کیفیت سے خالی نہیں، اس کے صاحب ذوق ہونے کا بڑا ثبوت یہ ہے کہ تلاش مقصد میں دیر وحرم کی تمیز اٹھادی تھی اور جس نیاز کیشی کے ساتھ مسلمان فقراء کے آگے سر جھکاتا تھا، ویسی ہی عقیدت ہندو رشیوں سے بھی رکھتا تھا۔ اس اصول سے کون صاحب حال اختلاف کرسکتا ہے؛ کیوں کہ اگر اس عالم میں بھی کفر واسلام کی تمیز ہو تو پھر اعمیٰ اور بصیر میں کیا فرق باقی رہ گیا؟ پروانہ کو تو شمع ڈھونڈھنی چاہیے، اگر صرف شمع حرم ہی کا شیدا ہے تو سوز طلبی میں کامل نہیں

''عاشق ہم از اسلام خرابست وہم از کفر
پروانہ چراغ حرم و دیر ندانند''

سرمد اور دارا شکوہ کے تعلقات کے تناظر میں مولانا آزاد نے جو لکھا ہے وہ افراط وتفریط اور ''لغو'' سے پاک ومبرا بھی ہے۔ مولانا سرمد اور دارا شکوہ کے تعلقات کے باب میں رقم طراز ہیں:

''سرمد جوش وجنوں میں پھرتا ہوا جب شاہ جہان آباد (دہلی) پہنچا تو قضا نے اشارہ کیا کہ قدم روک لئے جائیں؛ کیوں کہ جس جام کی تلاش ہے وہ اسی میخانہ میں ملے گا۔ مصنف مراۃ الخیال جو عالمگیر پرستی کے معبد میں صف اولیں کا طالب ہے، لکھتا ہے: ''چوں خاطر سلطاں دارا شکوہ بجانب مجانین میل داشت صحبت بہ وے درگرفت''۔ بیچارہ علی شیر بھی ہوشیاری ودیوانگی کی بحث میں سر مار رہا ہے، اسے کیا خبر کہ دنیا میں ایسے ترازو بھی ہیں جن کے ایک پلّے میں اگر دیوانگی رکھ دی جائے تو دوسرا پلّہ تمام عالم کی ہوشیاری رکھ دینے سے بھی نہیں جھک سکتا اور پھر ایسے خریدار بھی ہیں جن کو اگر ہوش وحواس کا تمام سرمایہ دے دینے سے ایک ذرہ جنون مل سکتا ہو تو بازار یوسف کی طرح ہر طرف سے ہجوم کریں۔ بہر کیف خواہ کچھ ہو، عالمگیرؒ کی ہوشیاری سے تو ہمیں دارا شکوہ کی دیوانگی اور جنون دوستی پسند آتی ہے کہ وہاں تو تیغ ہوشیاری کشتگان حسرت کے خون سے رنگین ہے اور یہاں خود اپنے جسم کے رگہائے گردان سے خون کی نالیاں بہہ رہی ہیں۔ شاید دارا شکوہ بھی عالمگیر جیسے ہوشیاروں کی ہوشیاری سے تنگ آگیا تھا؛ اس لئے اس نے

سرمدؔ جیسے مجانین کی صحبت کو ہوش والوں کی مجلس پر ترجیح دی۔ غرض کہ سرمد دارا شکوہ کی صحبت میں رہنے لگا اور اسے بھی سرمد سے کمال عقیدت تھی۔ اس زمانہ میں عشق کی شورش انگیزیاں کبھی کبھی اسے باہر نکلنے پر مجبور کرتیں؛ لیکن چوں کہ معلوم ہو چکا تھا کہ آخری امتحان گاہ یہی ہے؛ اس لیے شاہجہان آباد سے نکل نہیں سکتا تھا، یہاں تک کہ شاہجہاں کی علالت اور دارا شکوہ کی نیابت نے عالمگیری ارادوں کے ظہور کا سامان کر دیا اور ایک عرصہ کی شورش وخون ریزی کے بعد ۹۶۰ھ میں عالمگیر اورنگ زیب تخت نشیں حکومت ہوا۔ یہ زمانہ دارا شکوہ کے ساتھیوں اور ہم نشینوں کے لیے (بلکہ) خود دارا شکوہ کے لیے کم مصیبت انگیز نہ تھا۔ بہت سے لوگ تو دارا شکوہ کے ساتھ نکل گئے اور جو رہ گئے انہوں نے اپنے آپ کو 'کشتی طوفان' میں پایا؛ لیکن اس رہین بے خبری (سرمد) کو اپنے استغراق میں اس کی فرصت کہاں ملتی تھی کہ دنیا کو نظر اٹھا کے دیکھے اور اگر دیکھتا بھی تو وہاں سے کیوں کر نکلتا؛ کیوں کہ بایں ہمہ بے خبری اس سے بے خبر نہ تھا کہ اب تک جو کچھ ہوا ہے۔ عشق کی ابتدائی منزلیں تھیں، آخری منزل طے کرنی باقی ہے اور وہ یہیں پیش آنے والی ہے ؎

''بیک دہ زخم کہ خوردن زعشق امن مباش
کہ در کمیں گہ ابرو کمان کش ست ہنوز''

مولانا آزاد کے اس بیان میں صداقت بھی نظر آتی ہے کہ اورنگ زیب عالمگیر علیہ الرحمہ کے تخت نشیں ہوتے ہی دارا شکوہ کے محبین ومتوسلین اور دارا شکوہ کو 'خسروئ شاہانہ' کی دعا دینے والوں پر عتاب نازل ہو گیا تھا، چن چن کر سیاسی حکمت عملی کے تحت پس زنداں کئے جاتے رہیں یا پھر ان کو تختۂ دار پر لٹکایا جاتا رہا۔ اس کے تئیں کئی دلائل ہیں جو کہ تاریخی سے تعلق رکھتی ہیں؛ لیکن یہ بحث ایسی گنجلک، متضاد، غیر واضح اور مبہم ہے کہ کوئی تاریخ نویس اس کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش میں حوصلہ ہار جائے اور اس کی سانس پھول جائے؛ کیوں کہ اس سلسلے میں کوئی واضح تاریخ ہی موجود نہیں ہے، گرچہ سرمدؔ کے واقعات بیان نہ کرنے کے سیاسی مقاصد ہیں، جن کو سمجھنا لازمی ہے۔ میرے نزدیک اس کی سب سے بڑی وجہ جو کہ عیاں ہوتی ہے وہ یہ کہ سرمدؔ کو تختہ دار پر لٹکایا جانا اورنگ زیب عالمگیرؒ کی سیاسی حکمت عملی اور شرعی امور پر پابندی کی واضح نشانی ہے۔ اورنگ زیبؒ نے سرمدؔ کو تختہ دار پر کیوں لٹکایا۔ مولانا آزاد سرمدؔ کی شہادت متعلق یوں لکھتے ہیں:

''سرمدؔ کی شہادت کے اسباب تذکرہ نویسوں نے مختلف بتائے ہیں۔ تذکرۃ الخیال میں ہے کہ سرمدؔ کی اس رباعی پر جبہ پوشان شرع کے کان کھڑے ہوئے اور انہوں نے اسے کفر قرار دیا کہ معراج جسمانی سے انکار لازم آتا ہے:

''ہر کس کہ سر حقیقتش پا در شد
او پہن تر از سپہر پہنا در شد
ملا گوید کہ بر فلک شد احمد
سرمدؔ گوید فلک بہ احمد در شد''

مگر اس ترک سادہ کو فقیہانہ جنگ وجدال سے کیا سروکار تھا، اس نے نظر اٹھا کے دیکھا تک نہیں کیہ کور بصر کیا شور و غوغا کر رہے ہیں؟ وہ تو اس عالم میں تھا کہ جہاں ان اقرار و انکار کی بحثوں کی آواز بھی نہیں پہنچ سکتی ؎

''در عجایبہائے طور عشق حکمتہا کم ست
عقل را با مصلحت اندیشیٔ مجنوں چہ کار

لیکن اصل بات یہ ہے کہ عالمگیر کی نظروں میں تو سرمدؔ کا سب سے بڑا جرم دارا شکوہ کی معیت تھی۔ اور وہ کسی نہ کسی بہانے قتل کرنا چاہتا تھا۔ ایشیا میں ہمیشہ سے پالیٹکس مذہب کی آڑ میں رہا ہے اور ہزاروں خوں ریزیاں جو پولیٹیکل اسباب سے ہوئی ہیں انہیں مذہب کی چادر اوڑھا کر چھپایا گیا ہے''۔

مولانا آزاد مزید لکھتے ہیں:

''جب کوئی اور بہانہ نہ ملا تو عریانی و برہنگی کو خلاف رسم شرع ہے، بنیاد قرار دیا اور مذکورہ بالا رباعی سے نتیجہ نکالا کہ معراج جسمانی کا منکر ہے۔ ملا قوی اس زمانہ میں قاضی القضاۃ تھے، عالمگیر نے انہیں سرمدؔ کے پاس بھیجا کہ برہنگی کی وجہ دریافت کریں، ملا صاحب نے کہا ہے کہ باوجود کمال علم وفضل

برہنہ ومکشوف العورۃ کس عذر پر مبنی ہے؟ سرمد نے کہا کیا کروں شیطان قوی ہے اور فی البدیہہ یہ رباعی پڑھی ؎

''خوش بالائے کردہ چنیں پست مرا
چشمے بدو جام بردہ از دست مرا
او در بغل من ست و من در طلبش
دزدے عجبے برہنہ کردہ است مرا''

ملا صاحب برہم ہوئے اور برہم ہونے کی بات ہی تھی؛ کیوں کہ اسلام کی توہین نہیں کی گئی، مگر خود ان کے وجود اسلام عبارت کی سخت اہانت ہوئی، یعنی ان کا اسم سامی ابلیس لعین کا وصف قرار پایا۔ بہر کیف انہوں نے عالمگیر سے آکر کہا کہ کفر کا کافی مواد ہاتھ آگیا ہے اور قلمدان کھولنا چاہا کہ علمائے ظاہر کی تیغ خوں آشام اسی نیام میں رہتی ہے؛ لیکن عالمگیر کی عاقبت اندیشیوں نے صرف اس بہانے کو کافی نہ سمجھا، وہ خوب سمجھتا تھا کہ سرمد کوئی معمولی شخص نہیں ہے جس کا قتل ایک عامۃ الورود واقعہ سمجھا جائے گا، علم و فضل کے لحاظ سے کوئی اس کا ہمتا نہیں اور رجوع خلائق کا یہ حال ہے کہ سارا شاہجہان آباد اس کا معتقد اور ہوا خواہ ہے؛ اس لیے جب تک کوئی بہانہ قوی ہاتھ نہ آئے، اس ارادے کو ملتوی رکھنا چاہیے۔''

سرمد کے متعلق ظاہر پرست قاضیوں کی جو رائے تھی، اس رائے کے خلاف مولانا نے لکھا ہے کہ قاضیوں نے ہمیشہ باطن پرست اہل دل کو مشق ستم کا نشانہ بنایا ہے۔ جن اہل دل نے اسرار حقیقت سے قربت حاصل کی، انہیں اپنا سر دے کر نجات حاصل کرنا پڑی۔ اس ضمن مین مولانا آزاد لکھتے ہیں:

''اسلام کے تیرہ سو برس کے عرصہ میں فقہاء کا قلم ہمیشہ تیغ بے نیام رہا ہے۔ اور ہزاروں حق پرستوں کا خون ان کے فتووں کا دامن گیر ہے۔ اسلام کی تاریخ کو کہیں سے پڑھو، سینکڑوں مثالیں کہتی ہیں کہ بادشاہ جب خون ریزی پر آتا تھا تو دارالافتاء کا قلم اور سپہ سالار کی تیغ دونوں یکساں طور پر کام دیتے تھے۔ صوفیہ اور ارباب وطن پر منحصر نہیں، علمائے شریعت میں سے بھی جو نکتہ بیں اسرار حقیقت کے قریب ہوئے فقہاء کے ہاتھوں انہیں مصیبت اٹھانی پڑی اور بالآخر سر دے کر نجات پائی۔ سرمد بھی اسی تیغ کا شہید ہے ؎

چوں میرد و نظیری خونیں کفن بہ حشر
خلقے فغاں کنند کہ ایں داد خواہ کیست''

سرمد کی تقدیر میں جنون عشق کے ہاتھوں شہید ہونا لکھا تھا اور پھر خود سرمد نے اس کی طلب بھی کی تھی۔ بالآخر اتفاق رائے سے یہ تجویز طے ہوئی کہ سرمد کو مجلس میں بلایا جائے اور اس سے کشف العورۃ کے متعلق سوال کیا جائے؟ الغرض سرمد کو مجلس میں طلب کی گیا اور کشف العورۃ (برہنگی) کے متعلق سوال و جواب کیا گیا، مجلس طلبی اور پھر سوال و جواب کو مولانا آزاد کی زبانی سنیں، مولانا آزاد لکھتے ہیں:

''آخر الامر یہ قرار پایا کہ سرمد کو علماء و فضلائے عصر کے مجمع میں طلب کیا جائے اور تمام علماء کی جو رائے ہو قائم اس کے مطابق فیصلہ کیا جائے؛ چناں چہ مجلس منعقد ہوئی اور سرمد کو بلایا گیا۔ سب سے پہلے خود عالمگیر مخاطب ہوا اور پوچھا لوگ کہتے ہیں کہ سرمد نے داراشکوہ کو مژدۂ سلطنت دیا تھا، کیا یہ سچ ہے؟ سرمد نے کہا: ''ہاں''! اور وہ مژدہ درست نکلا کہ اسے ابدی سلطنت کی تاج پوشی نصیب ہوئی۔ عمامہ بندوں نے کہا کہ برہنگی شرع کے خلاف ہے اور اس کے لیے صاحب عقل و تمیز کا کوئی عذر مسموع نہیں، اس کا جواب تو سرمد نے پہلے ہی دے چکا تھا کہ ع

''دزدے عجبے برہنہ کردہ است مرا''

مولانا آزاد مجمع عام کی مزید تفصیل والہ داغستانی کی روایت سے نقل کرتے ہوئے لکھا کہ:

'والہ داغستانی انہیں (ایک معروف صوفی) بزرگ سے روایت کرتا ہے کہ جب مجمع علماء میں سرمد کو لباس پہننے کے لیے کہا گیا اور مسموع نہ ہوا تو بادشاہ نے علماء سے کہا کہ محض برہنگی وجہ قتل نہیں ہوسکتی، اس سے کہا جائے کہ کلمہ طیبہ پڑھے۔ اور یہ اس لیے کہا کہ بادشاہ سن چکا تھا کہ سرمد کی عادات عجیبہ میں سے ایک یہ عادت بھی ہے کہ کلمہ طیبہ جب پڑھتا ہے تو لا الٰہ سے زیادہ نہیں کہتا، علماء نے سرمد سے کلمہ پڑھنے کی خواہش کی تو اپنی عادت کے مطابق

صرف 'لا الٰہ' پڑھا کہ جملہ نفی ہے، اس پر علماء نے شور مچایا تو کہا "ابھی تک میں نفی میں مستغرق ہوں، مرتبہ اثبات تک نہیں پہنچا، اگر 'الا اللہ' کہوں گا تو جھوٹ ہوگا اور جو دل میں نہ ہو وہ زبان پر کیسے آئے؟ علماء نے کہا ایسا کہنا کفر صریح ہے۔ اگر توبہ نہ کرے تو مستحق قتل ہے۔ یہ ظاہر پرست نہیں جانتے تھے کہ سرمد اس سے بہت اونچا ہے کہ کفر و ایمان کی بحثیں سنائی جائیں اور وہ قتل و خون کے احکام سے مرعوب ہو۔ کفر ساز تو اپنے مدرسہ و مسجد کے صحن میں کھڑے ہو کر سوچتے تھے کہ اس کی کرسی کتنی اونچی ہے اور وہ اس منار عشق پر تھا جہاں کعبہ اور مندر بالمقابل نظر آتے ہیں اور جہاں کفر و ایمان کے علم ایک ساتھ لہراتے ہیں ؎

"کشورے ہست کہ در وے وہ و از کفر سخن
ہمہ جا گفت و شنو بر سر ایمان نہ رود

اور سرمد نے تو اپنی اصلی حالت بے کم و کاست بیان کر دی تھی۔ ایمان بالغیب پر جو لوگ قانع نہیں ہوتے اور اس عدم قناعت ہی کا نام 'تلاشِ حقیقت' ہے وہ اپنے اقرار کو مشاہدۂ غیبی سے استوار کرنا چاہتے ہیں۔ اور شاہد حقیقت کی رونمائی نقد شہادت ہے جو ابھی سرمد کو نصیب نہیں ہوئی تھی۔ پس جس چیز کو دیکھا نہ تھا کیوں کر کہہ دیتا کہ "ہے"۔ اس ملک میں جتنے رہرو ہیں سب ہی کو اس منزل سے دو چار ہونا پڑتا ہے؛ لیکن سرمد کا جرم یہ تھا کہ وہ جس جام کو چھپ کر پیتے ہیں، سرمد نے اعلانیہ منہ سے لگایا اور درۂ محتسب کا مستحق ٹھہرا۔"

اب جب کہ دربار عالمگیری میں وجہ قتل پختہ ہو چکی تھی، عمامہ اور خرقہ پوش اور دربارِ عالمگیری کے پرستان اکبر کو تختۂ دار پر لٹکائے جانے کی مضبوط دلیل ہاتھ لگ گئی تھی۔ شاید ظاہر پرست علماء کے دامن پر کاتب تقدیر نے سرمد کا خون لکھا تھا، کیوں کہ سرمد اس کی آمد کی دیرینہ خواہش کا بڑی شدت سے کیا تھا، اُس نے اِس خواہش کو سن لیا تھا، مگر اپنے محبوب کی شہادت کا خون اپنے ذمہ نے لے کر اوروں پر کندھے پر ڈال دیا۔ آگے کی داستان مولانا آزادؒ کی زبانی ہی سنیں، مولانا لکھتے ہیں:

"غرض کہ جب سرمد نے توبہ نہ کی تو علماء نے بلا تامل فتوائے قتل صادر کیا اور دوسرے دن قتل گاہ میں لے گئے، بموجب بیان مراۃ الخیال یہ واقعہ ۱۰۷۱ھ میں ہوا کہ عالم گیر کی تخت نشینی کو تین سال سے زیادہ زمانہ نہیں گزرا تھا ؎

"مو بمو یم دوست شد ترسم کہ استیلائے عشق
یک انا الحق گوئے دیگر بر سر دار آورد"

شاہ اسد اللہ نامی ایک مرد درویش وحق آگاہ راوی ہیں کہ:

"مجھے سرمد کی خدمت میں کمال خصوصیت حاصل تھی۔ جب شورش و ہنگامہ شروع ہوا تو مجھ سے نہ رہا گیا۔ ایک دن موقع پا کر عرض کیا کہ اگر اپنی وضع و حالت بدل لیں تو بندگان الٰہی کی منت و سماجت دیکھتے ہوئے بظاہر کوئی نقصان نہیں" یہ سن کر نظر اٹھائی اور اپنا شعر پڑھ دیا ؎

"عمریست کہ آوازۂ منصور کہن شد
من از سر نو جلوہ وہم دار و رسن را"

آخر الامر سرمد کو تختۂ دار پر لٹکائے جانے کا دن اور وقت مقرر ہوا اور پھر ایک صوفیٔ حال مست، مجذوب اور فنا فی العشق کو شرعی امور کے تحت ظاہر بینوں کے ہاتھوں از قلم فقہ و فتاویٰ سولی دے دی گئی۔ آگے کی تفصیل مولانا آزاد کی زبانی سنئے! مولانا آزاد لکھتے ہیں:

"جب سرمد کو شہادت گاہ لے چلے تو بیان کیا جاتا ہے کہ تمام شہر ٹوٹ پڑا تھا اور اس قدر ہجوم تھا کہ راہ چلنا دشوار ہو گیا تھا۔ عشق کی نیرنگیوں کو کیا کہیے؟ جہاں کا عام پسند تماشا خوں ریزی ہے، جہاں قربانی سے بڑھ کر کوئی دل پسند کھیل نہیں ہے، جب کوئی سر دادہ سر بکف بڑھتا ہے تو معلوم ہوتا دولہا کی سوار جا رہی ہے اور براتیوں کا ہجوم ہے کہ شانے سے شانہ چھلتا ہے۔

"بہ جرم عشق تو ام، می کشند و غوغائے ست
تو نیز بر سر بام آ، کہ خوش تماشائے ست"

مگر یہ عشق مجازی تھا کہ سر بام آنے کی خواہش کی گئی ورنہ سرمد کو سر اٹھانے کی بھی ضرورت نہ ہوئی۔"

ثناغزل۔ریسرچ اسکالر: مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی حیدر آباد

حیات اللہ انصاری کے افسانوں میں نچلے طبقے کے بچوں کی عکاسی

حیات اللہ انصاری ایک مشہور ترقی پسند افسانہ نگار، ممتاز ناول نویس، نقاد اور صحافی رہے ہیں۔ اس حیثیت سے وہ اردو ادب میں ہمہ جہت شخصیت کے مالک ہیں۔ انھوں نے تین ناول لہو کے پھول ۱۹۶۹ء، مدار ۱۹۸۱ء اور گھروندا ۱۹۸۲ء میں تصنیف کیے۔ ان کے چار افسانوی مجموعے انوکھی مصیبت، بھرے بازار میں ۱۹۳۵ء، شکستہ کنگورے، ۱۹۴۶ء، ٹھکانہ ۱۹۹۲ء میں منظر عام پر آئے۔ اس کے علاوہ ”جدیدیت کی سیر“ کے عنوان سے تنقیدی کتاب ۱۹۸۷ء میں لکھنو سے شائع ہوئی۔ حیات اللہ انصاری کو گاندھی جی سے خاص عقیدت تھی، آخری وقت تک کانگریس سے جڑے رہے۔ اسی عقیدیت کی بنا پر جواہر لال نہرو نے انھیں 'قومی آواز' کا مدیر مقرر کیا۔ اس سے قبل وہ ہفتہ وار ”ہندوستان“ (۴۲۔۱۹۳۷) کے مدیر رہ تھے۔ بعد میں رسالہ ”سب ساتھ“ (۸۵۔۱۹۸۸) اور ”سچ رنگ“ (۹۰۔۱۹۸۸) کے لیے خدمات دیں۔ 'لہو کے پھول' کے لیے ۱۹۷۰ء میں ساہتیہ اکادمی انعام عطا ہوا۔ پانچ جلدوں پر مشتمل یہ اردو کا سب سے طویل ناول ہے۔

حیات اللہ انصاری نے اپنے ہم عصروں کے مقابلے کم افسانے تخلیق کیے۔ لیکن ان کی تخلیقات ادبی حلقے میں سراہی گئیں۔ وہ قلیل سرمائے کے باوجود اپنی منفرد شخصیت کو قائم رکھنے میں کامیاب رہے۔ ان کے مشہور افسانے آخری کوشش، ڈھائی سیر آٹا، شکستہ کنگورے، بھیک، ماں بیٹا، انوکھی مصیبت اور بھرے بازار میں ہیں۔ بقول اسلم جمشید پوری۔ ” آخری کوشش اردو کا لازوال افسانہ ہے۔ آخری کوشش کفن سے زیادہ کامیاب افسانہ ہے“ [۱]

حیات اللہ انصاری نے اپنے افسانوں میں بچوں کو بھی موضوع بنایا ہے۔ زیر نظر مضمون میں اُن افسانوں کا جائزہ لیا گیا ہے جن میں بچے بطور اہم کردار کے یا ان کے مد مقابل کے طور پر شامل ہیں۔ میری نظر میں یہ افسانے توجہ کے مستحق ہیں، تا کہ بچوں کے کردار کو قارئین سے روبرو کیا جا سکے۔ حیات نے اپنے افسانوں میں غربت میں پل رہے بچوں کی نفسیات کو کامیابی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ان کی زندگی سے پردہ اٹھانے کی کوشش کی ہے جو غربت میں زندگی بسر کر رہے ہیں، جن کو ایک وقت کا کھانا میسر نہیں، جو سماجی اور معاشی بدحالی کے شکار ہیں۔ اس قسم کے افسانوں میں ڈھائی سیر آٹا، بھیک، بڈھا سودخوار، وغیرہ اہم ہیں۔ ان کے متعلق ڈاکٹر صادق لکھتے ہیں۔ ”حیات اللہ انصاری نے اپنے افسانوں میں سماج کے دبے کچلے طبقے کو اس کے صحیح سیاق میں حقیقی خدوخال کے ساتھ بڑی کامیابی سے پیش کیا ہے۔“ [۲]

حیات اللہ انصاری نے پریم چند کی روایت کو آگے بڑھایا ہے۔ افسانوں میں اپنے عہد کی سچائی اور تلخ حقیقت کو پیش کر کے سماج کو آئینہ دکھانے کی کوشش کی ہے۔ ڈاکٹر صادق مزید لکھتے ہیں کہ۔ ” ۱۹۳۰ء کے بعد جو افسانہ نگار ابھر کر سامنے آئے ان میں سے بیشتر افسانے زندگی کی تفسیر اور ترجمان کا کام کیا اور حقیقت نگاری کی روایت کو آگے بڑھایا۔ ان افسانہ نگاروں میں حیات اللہ انصاری خصوصی اہمیت رکھتے ہیں۔“ [۳]

حیات اللہ انصاری کو انسانی نفسیات پر کامل دسترس حاصل ہے۔ ان کے افسانوں میں محبت، دردمندی اور انسان دوستی کے جذبات پائے جاتے ہیں۔ اس کی نمایاں مثال ان کے افسانے ماں بیٹا اور موزوں کا کارخانہ میں دیکھی جا سکتی ہے۔ ہم ان کے چند ایسے افسانوں کا جائزہ لیں گے جن میں بچے خاص کردار کے طور پہ پیش کیے گئے ہیں۔ ان کا پہلا مطبوعہ افسانہ ”بڈھا سودخوار“ جون ۱۹۳۰ء میں

رسالہ" جامعہ" میں شائع ہوا۔ اس میں انسانوں کے استحصال کے خلاف آواز بلند کی گئی ہے۔ افسانہ پڑھنے کے بعد قاری ظلم کے خلاف اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ ڈاکٹر صادق نے اس جانب اشارہ کیا ہے کہ۔" بڈھا سود خوار قاری کے ذہن میں استحصال کے خلاف ایک خاموش جلوس کی کیفیت پیدا کر دیتا ہے۔"[۴]

"بڈھا سود خوار" کا اہم کردار سدھارمل ہے۔ جو مستقبل کی فکر میں اپنے اور اپنے اہل خانہ کو اذیت پہنچاتا ہے۔ پیسہ بچانے کی فکر میں اپنے بیوی بچوں کی ضروریات کو نظر انداز کرتا ہے۔ بیوی 'سیتلا' کے سخت اور شدید بخار میں ملوث ہونے کے باوجود اس کے لیے عرق منگوانے میں آنا کانی کرتا ہے۔ حد تو یہ ہے کہ وہ خود کا علاج بھی نہیں کرتا کہ پیسے ختم ہو جائیں گے۔ درد کی وجہ سے لنگڑا کر چلتا ہے لیکن اس کے نزدیک دوا کرنے سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہوں:

"فائدہ دینا نہ دینا تو بھگوان کے اختیار میں ہے۔ لوگ سینکڑوں روپے دواؤں میں خرچ کر ڈالتے ہیں اور پھر بھی فائدہ نہیں ہوتا۔ لالہ جگن ناتھ کہتے تھے کہ ایک دفع ان کے گاؤں میں بخار پھیلا، آدھا گاؤں تہس نہس ہو گیا۔ کسی ڈاکٹر وید کے کئے کچھ نہ ہو سکا تب کہیں سے ایک سادھوں آ گیا جس نے لوگوں کو گولر کے پتے بتائے۔ لوگوں نے پینا شروع کئے۔ آٹھ ہی دن میں سب چنگے ہو گئے۔"[۴]

راجو، سدھارمل کا بیٹا ہے اس کو ماں کی بیماری دیکھی نہیں جاتی تو کہتا ہے کہ ڈاکٹر رام بہاری کو دکھا دیجئے ہومیو پیتھک کی دوائیں سستی مل جاتی ہیں۔ لیکن باپ کی دلیل کے آگے مجبور:

"بیٹا علاج سے کچھ نہیں ہوتا۔ صحت ہونا بھگوان کی مرضی پر ہے۔ لالہ خوشحال چند نے ہزاروں روپے پانی کی طرح بہا دیا مگر نہ اچھے ہوئے۔ علاج تو ایک بہانہ ہے۔"[۵]

اس افسانے میں بچوں کے دو کردار اہم ہیں۔ پہلی نو برس کی بچی "سندری" اور دوسرا اس کا بھائی "راجو" دونوں سدھارمل کے بچے ہیں۔ دونوں کا ذہن بالکل مختلف ہے۔ سندری اپنی ماں کا خوب خیال رکھتی ہے۔ اپنے بھائی اور باپ کو کھلانے کے بعد اگر کچھ بچا تو خود کھاتی ہے۔ لیکن راجو صرف اپنے بارے میں سوچتا ہے۔ کتاب خریدنے کے بہانے سے کلب کے لئے پیسہ مانگتا ہے۔ پوری کے لیے چار آنہ لیتا ہے لیکن اس میں سے بھی دو آنہ بچا کر رکھ لیتا ہے۔ گھر میں جب راجو کھانا کھاتا ہے تو اپنی بہن سے سخت الفاظ میں کہتا ہے:

"سندری یہ باسی روٹیاں تجھ سے نہیں کھائی گئیں۔ ایک روٹی یہ بھی کھالی ہوتی۔ میں نے ہی پتا جی سے پیسے مانگے تھے اور مجھ ہی کو یہ بھی کھانا پڑے گی۔ میں پیسے نہ مانگتا تو پھر مزا معلوم ہوتا۔ دن بھر بھوکی پڑی رہتیں۔"[۶]

سدھارمل اس قدر سخت جان اور بیٹا پرست ہے کہ اس کو اپنی بیٹی، بیوی کے دوا در پٹو دوران کے کھانے پینے تک کی کوئی فکر نہیں ہے۔ لیکن بیٹے کا کھانا پوچھ لیتا ہے۔ پہلے خود کھاتا ہے اور بچی ہوئی تین روٹی میں سے دو راجو کے لیے رکھ دیتا ہے۔ اپنی بیٹی سے پوچھتا بھی نہیں کہ اس نے کھایا یا نہیں یا وہ کیا کھائے گی۔ لیکن اس کو اپنی نو سال کی بچی کی شادی کی فکر ضرور رہے۔ بیٹی سندری کے کہنے پر بھی اسے کوئی فکر نہیں ہوتی ہے:

"اچھا لو اس وقت کم ہی کھاؤں گا۔ دو روٹیاں اور یہ آلو راجو کے لئے رکھ دو۔"[۷]

بیٹی اور بیوی کی جانب سے اس قدر بے پرواہی، لیکن شادی کی فکر سماج کے لیے ایک ایسا المیہ ہے جس کا تدارک ضروری ہے۔ یہاں بیٹی کی شادی کی فکر پہلے کی جاتی ہے۔ لیکن اس کی بنیادی ضروریات کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ یہ مسائل آج بھی ہمارے معاشرے میں موجود ہیں۔

سندری کے کردار کو حیات اللہ انصاری نے بڑی خوبصورتی سے ابھارا ہے۔ نو برس کی یہ بچی والدین کی خدمت گزار ہے۔ اسے سب سے زیادہ ماں کی فکر ہے۔ ہر وقت بیمار ماں کا خیال رکھتی ہے۔ ماں کی تکلیف کو دیکھ کر باپ سے کہتی ہے:

"پتا جی اماں کے لئے عرق منگوا دیجئے۔ پیاس بہت ہے پانی پیتی ہیں تو کلیجے میں لگتا ہے۔"[۸]

"ڈھائی سیر آٹا" حیات اللہ انصاری کا اہم افسانہ ہے۔ جس میں غریب بچوں کی نفسیات کو پیش کیا گیا ہے۔ بھوکے بچوں کو

کھانے کے علاوہ کچھ بھی نظر نہیں آتا۔ دانے اور نوالے کو ترستے ان بچوں کو چاول پکنے کی بد بداہٹ راگنی معلوم ہوتی ہے۔ ایک دن مولا کو سڑک پر گدھا ہوا آٹا ملا جسے ایک فقیرنی بھی پھینک کر چلی گئی تھی۔ ماں نے اس آٹے سے پُری بنائی اور گھر کے تمام افراد نے شکم سیر ہو کر کھایا۔ اس دن بچے اپنی ماں سے کہتے ہیں ماں آج کہانی سناؤ، تو ماں نے بچوں کو شہزادے کی کہانی سنائی۔

ماہر نفسیات ماسلو نے انسانی ضروریات کا نظریہ پیش کیا ہے۔ اس کے مطابق جسمانی ضرورتیں سب سے اہم ہوتی ہیں۔ اس کی تکمیل کے بغیر انسان دیگر ضروریات کی طرف رخ نہیں کر سکتا۔ کہا جاتا ہے کہ خالی پیٹ تو اللہ کی عبادت میں بھی مَن نہیں لگتا۔ یہ حقیقت ہے کہ جاندار کی پہلی ضرورت پیٹ بھرنا ہے اس کے بعد ہی وہ کسی دیگر شی کے بارے میں سوچ سکے گا۔ افسانے میں بچے ماں سے اسی وقت کہانی سنانے کو کہتے ہیں جب ان کا پیٹ بھرا ہوتا ہے۔ یعنی پیٹ بھرنا ہماری سب سے اوّلین ضرورت ہے۔ جب مولا گلی سے آٹا اٹھا رہا تھا تو کچھ مزدور اسے طعنہ دے رہے تھے۔ کہ ہم غریب ہیں لیکن گلی کا گرا پڑا نہیں کھاتے۔ یہاں بھی مولا عزت نفس کی فکر نہیں کرتا۔ کیونکہ وہ اس وقت تک سوچنے سے معذور ہے جب تک اس کی بنیادی ضرورتیں پوری نہ ہوں۔ خود تعزیمی اور عزت نفس تو کافی بعد کی چیز ہے۔

حیات اللہ انصاری نے معاشرے میں پھیلے ان مسائل پر نظر کی ہے جس پر عام لوگوں کی نظر کم ٹھہرتی ہے۔ ان کے افسانوں کی یہ خوبی ہے کہ وہ معاشرے کی بے لاگ حقیقت کو پیش کر دیتے ہیں۔ زندگی کے اچھوتے پہلوؤں سے سماج کی برائیوں کو ظاہر کرتے ہیں۔ جسے پڑھ کر قاری کے دل میں برائی سے نفرت پیدا ہو۔

افسانہ ''بھیک'' افسانوی مجموعے ''شکستہ کنگورے'' میں شامل ہے۔ اس کی اہم کردار رجنی نامی بچی کی ہے۔ جس کی عمر تقریباً بارہ تیرہ برس ہے۔ غربت کی وجہ سے وہ کافی کمزور اور دبلی پتلی ہے اسے دیکھنے سے ہی غربت جھلکتی ہے۔ یہ بچی اپنے چھوٹے بھائی بہنوں کا ماں کی طرح خیال رکھتی ہے۔ والدین کا سایہ سر سے اٹھ چکا ہے۔ رجنی ان سبھی کے ساتھ ایک کھنڈر میں بھوک، ڈر اور بے بسی کے ساتھ زندگی گزارنے پر مجبور ہے۔ کیلاش ان کی زندگی میں امید کی کرن بن کر آتا ہے۔ لیکن وہ بھی بچوں کی تعداد دیکھ کر ہاتھ کھینچ لیتا ہے۔ صبح جس امید کے ساتھ وہ کیلاش کے پاس جاتے ہیں شام تک ناامیدی اور مایوسی کے ساتھ واپس لوٹ آتے ہیں۔ جہاں بھوک، پیاس اور ڈر ان بچوں کی منتظر ہے۔ اس افسانہ میں حیات نے بچوں کے جذبات کی کامیاب عکاسی کی ہے۔ جب ننھے منے بچوں کا قافلہ یاس و امید کے ساتھ چلتا ہے تو ان کی معصومانہ باتیں سن کر قاری کے دل میں جذبات کی لہر دوڑ جاتی ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

''کلو۔ اوپر پتا اور ماں ملیں گی۔''

منی۔ ''نہیں۔ الو۔ وہ نہیں۔ وہ تو مر گئے۔''

کلو۔ ''جو مرتے ہیں کیا وہ اوپر بھی نہیں ملتے؟''

منی۔ (بہت سنجیدگی سے) وہ کہیں نہیں ملتے۔ ہم لوگ ایک بابو جی کے پاس جا رہے ہیں جو پتا جی ہی کی طرح روٹی دیں گے۔ کپڑے دیں گے۔ اور اوڑھنے کو دیں گے۔''[9]

رجنی اس لیے مسرور ہے کہ اب اسے اور بہن بھائیوں کو کھانے پینے کے سامان اور کپڑے ملیں گے، اب انہیں وہاں پر ڈر بھی نہیں ہوگا۔ خوشی سے سرشار یہ قافلہ پچاس فٹ سے زیادہ اونچا پہاڑ چڑھ جاتا ہے۔ کیلاش بچوں کی تعداد دیکھ کر غصہ میں رجنی سے کہتا ہے تم نے کل تو ایک بار بھی نہیں بتایا کی تمہارے پانچ بھائی بہن ہیں۔ تم اتنی بڑی فوج کو لیکر آئی ہو میں انہیں ہرگز نہیں رکھ سکتا، کیلاش کی باتیں رجنی کے سر پر بجلی بن کر گری۔ اسے اپنے بھائی بہنوں سے وقتی نفرت ہو جاتی ہے۔ اس کا دل چاہتا ہے کہ وہ اپنے ساتھ ان سارے بچوں کو مار ڈالے۔ اس جارحانہ کیفیات کو افسانہ نگار نے یوں بیان کیا ہے:

''یہ سن کر رجنی پر بجلی گر پڑی۔ اتنی بڑی مایوسی کا سامنا اس نے زندگی میں پہلی بار کیا تھا۔ اس کا چہرہ بالکل سوکھ گیا اور آنکھیں اندر ڈوب گئیں مگر منہ سے کچھ نہ نکل سکا۔ اس کے سب بھائی بہنوں کا بھی یہی حال ہوا۔ کلو تو پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔''[10]

کیلاش کے ضمیر نے گوارہ نہیں کیا کہ بچوں کو خالی ہاتھ واپس کرے، لہٰذا اس نے رجنی کو پاس بلا کر دو روپے بھیک میں دے دیا۔ پیسہ لے کر رجنی بھائی بہنوں کے ساتھ بازار گئی اور سب نے پوری کھائی۔ پھر وہ دو روپیہ ختم کر کے اپنی اسی اندھیری دنیا میں چلے گئے۔ جہاں بھوک کی شدت ان کا انتظار کر رہی تھی۔ اس افسانے

میں بچے ماں باپ کے پیار اور بھوک سے تڑپ رہے ہیں۔ انہیں بنیادی ضروریات روٹی، کپڑا اور مکان تک میسر نہیں ہے۔ کیلاش کے یہاں سے ناامیدی ہاتھ لگنے پر وہ دوسری طرف ایک نئی امید پر نکل پڑتے ہیں۔

''موزوں کا کارخانہ'' افسانوی مجموعے ''شکستہ کنگورے'' میں شامل ہے۔ اس میں تین برس کے لارنس کی نفسیات کو پیش کیا گیا ہے۔ وہ کھڑکی کے پاس کھڑا ہو کر روتا رہتا ہے۔ اس کی ماں اسے نوکر کے حوالے کر کے کام کرنے چلی جاتی ہے۔ لیکن نوکر بھی اسے کمرے میں بند کر دیتا ہے، تاکہ وہ اس کی غیر موجودگی میں باہر نہ چلا جائے۔ وہ بچہ صبح سے لے کر شام تک دروازے کے پاس کھڑا ہو کر روتا رہتا۔ اس کا ہر دن کا وہی معمول تھا وہ وہیں روتے روتے سو جاتا۔

جب پروفیسر (کتاب لکھنے کے لیے) لانس کے فلیٹ میں گئے تو بچے کے رونے کی آواز سن کر پریشان ہوئے۔ انہیں دو دن میں ہی رونے کا مکمل ٹائم ٹیبل معلوم ہو گیا۔ جب ان کا تجسس حد سے بڑھا تو وہ بچے (لارنس) کو دیکھنے پہنچ گئے۔ اسے روتا دیکھ کر ان کے دل میں پیار کے جذبات امڈ آئے۔ وہ اس کو بلا کر پیار سے باتیں کرنے لگے۔ لارنس کی معصوم باتیں سن کر اسے خوب پیار کیا۔ اقتباس:

''بتاؤ کیوں روتے ہو''

''رونا آ کر مجھے رلاتا ہے''

اس جواب پر میں بے اختیار ہنس پڑا۔ پھر پوچھا۔ رونا کہاں سے آتا ہے؟

بچے نے فوراً آنکھوں کی طرف اشارہ کیا۔ ''یہاں سے''

پھر اسے خیال آیا کہ وہ غلط کہہ رہا ہے اور منہ کی طرف اشارہ کر کے بولا۔ ''نہیں نہیں۔ یہاں سے۔'' لیکن فوراً اس کی غلطی کی بھی تصحیح کی اور پھر آنکھوں کی طرف اشارہ کر کے بولا۔ ''نہیں نہیں دیکھئے یہیں ہے۔''

مجھے پھر ہنسی آ گئی۔ میں نے پوچھا۔ ''رونا آتا کیوں ہے؟'' بچے نے برجستہ جواب دیا۔

''مجھے رلانے کے لئے''[11]

لارنس سے گفتگو کرنا انہیں بھلا معلوم ہوا۔ پہلے وہ اس کے رونے سے پریشان ہو جاتے تھے۔ اب اس سے کئی کئی گھنٹے باتیں کرنے لگے۔ ان کو احساس ہو گیا کہ بچہ صرف پیار کا بھوکا ہے۔ ان کو بچے سے انسیت ہو گئی۔ لارنس ان کی ساری باتیں ماننے لگا۔ جب وہ کمرے میں اپنے مسودے پر کام کرتے تو لارنس ان کو کھڑکی سے دیکھتا رہتا۔ کچھ ہی دنوں میں وہ ان سے اتنا گھل مل گیا کہ ان کے کمرے پر کئی کئی چکر لگانے لگا۔ ایک رات وہ انکل کے پاس سونے کی ضد کرنے لگا۔ ماں اسے لے کر پروفیسر کے پاس گئی اور کہا کہ آج رات لارنس کو اپنے پاس سلا لیجئے۔ لارنس انکل کی جانب امید اور ڈر کے ساتھ دیکھتا رہا کہیں انکل خفا نہ ہو جائیں۔ لیکن جب انکل اس کو گود میں اٹھا لیتے ہیں تو وہ خوشی سے جھوم اٹھتا ہے پھر گلے میں باہیں ڈال کر معصومانہ انداز میں کہتا ہے:

''میں بالکل نہیں بولوں گا۔ آپ کو کام کرنے دوں گا۔ آپ کی چیزیں بھی نہیں چھوؤں گا۔ پانی خود اٹھا کر پی لوں گا۔ باتھ بھی خود چلا جاؤں گا۔''[12]

جاتے ہوئے لارنس کی ماں اپنی تکلیف اور غم کا بیان ان الفاظ میں کرتی ہے:

''ایک بات میں اور کہہ دوں پروفیسر صاحب جو میرے دل پر پتھر کی طرح رکھی ہوئی ہے۔ وہ یہ کہ میں بری عورت نہیں ہوں۔ اس کے باپ نے مجھے بلا وجہ طلاق دی اور اب جس طرح بنتا ہے اپنا اور اس کا پیٹ پالتی ہوں۔''[13]

ماں اور بچے کی بات سن کر قاری کی ہمدردی ان کے ساتھ ہو جاتی ہے۔ بنیادی ضروریات کی تکمیل کے لیے ماں اپنے بچے کو کمرے میں بند کر کے جاتی ہے۔ اس افسانے میں حیات اللہ انصاری نے ایک ایسی ماں کی سچائی کو پیش کیا ہے جس کا اس کے بچے کے سوا کوئی نہیں ہے۔

حیات اللہ انصاری کا ایک افسانہ ''ماں بیٹا'' ہے۔ جو تقسیم کے بعد ہوئے فرقہ وارانہ فساد کے پس منظر میں لکھا گیا ہے۔ اس کی خاص کردار ''مومنہ'' نامی عورت ہے۔ فسادیوں نے اس کے گھر کو تباہ و برباد کر دیا۔ اس کے سامنے ماں، باپ، شوہر اور دودھ

پیتی بچی کو قتل کر دیا گیا۔ فسادیوں نے عورتوں سے عصمت دری کی جس میں مومنہ بھی شامل تھی۔ اسے معلوم ہوا کہ وہ پاکستان کی سرحد سے قریب ہے۔ لیکن وہاں کا پورا گاؤں خالی ہے۔ ایک جگہ اللہ اکبر لکھا دیکھ کر خوش ہوئی۔ وہ ارادہ کرتی ہے کہ میں اب یہیں رہے گی۔

افسانے میں ''آشا'' نام کی کتیا ہے جو مومنہ کو کہیں لے جانے کی کوشش کرتی ہے۔ مومنہ جب وہاں جاتی ہے تو کیا دیکھتی ہے کہ ایک چھ سال کا معصوم بچہ ''رامو'' آگ میں جھلسا ہوا زخمی حالت میں پڑا ہوا ہے وہ کھسک کر پرنالے کے نیچے گڈھے کو ٹٹول کر پانی تلاش کر رہا ہے۔ وہ درد سے کراہ کر ہائے ماں کی آواز نکال رہا ہے۔ لفظ 'ماں' سن کر مومنہ کی ممتا امڈ آئی لیکن اچانک رامو کے منہ سے ''ہے رام'' کا لفظ سن کر اسے چھوڑ کر چلی گئی۔ لیکن اس کی آنکھوں سے نیند غائب رہی صبح اٹھتے ہی وہ فوراً رامو کے پاس گئی اور اس کی تیمارداری کرنے لگی۔ وہ اپنے رویے پر حیران تھی کہ اسے کیوں ہندو بچے پر پیار آرہا ہے جب کہ انھوں نے ہی اس کی دنیا اجاڑ دی اس کے ساتھ زنا کاری تک کی گئی۔

دوسری جانب رامو کو بھی مسلمانوں سے سخت نفرت ہے جنھوں اس کے گھر والوں کو قتل کر دیا۔ وہ انھیں مارنے کا طرح طرح سے منصوبہ بناتا ہے، تاکہ اپنا بدلہ لے سکے۔ مومنہ اس کا خوب خیال رکھتی ہے تو اسے یوں محسوس ہوتا ہے کہ اس کی ماں واپس آگئی ہے۔ وہ مومنہ سے ان واقعات کو بیان کر کے پھوٹ پھوٹ کر روتا ہے۔ اس معصوم بچے کے دل میں اس قدر نفرت ہے کہ ایک بار مومنہ سے کہتا ہے کہ مسلمانوں سے کیسے بدلا لیگا:

''میں جب اچھا ہو جاؤں گا تو دو کام کروں گا۔ ایک تو ہوائی جہاز اڑانا سیکھوں گا۔ اور دوسرے بم بنانا۔

مومنہ اس خوفناک خیال کو بھانپ گئی۔ ''پھر کیا کرو گے بیٹا''

''میں بہت سے بم ہوائی جہاز پر رکھ کر اڑ جاؤ گا اور جہاں دیکھوں گا کہ کسی مسجد میں بہت سے مسلمان جمع ہیں ان پر بم گرا دوں گا اور اڑ جاؤں بم گرے گا دھم کسی کا کان اڑ جائے گا۔ کسی کی ناک اڑ جائے گی۔ کسی کا سر۔ کسی کے توند چیتھڑے چیتھڑے ہو جائے گا۔ کوئی روئے گا۔ کوئی ہائے ہائے کرے گا۔ کوئی اللہ کو پکارے گا۔'' [۱۴]

رامو کو زندگی کی تلخ حقیقتوں نے اتنے زخم دیے ہیں کہ اس کا معصوم ذہن نفرت، غصہ اور انتقام سے لبریز ہو چکا ہے۔ اس کے بچپن کو فسادیوں نے کچل ڈالا، اب وہ صرف مرنے مارنے کی باتیں کرتا ہے۔ افسانے کے اخیر میں اسے احساس ہوتا ہے کہ مومنہ مسلمان ہے یہ حقیقت بھی اس کے سامنے عیاں ہوئی کہ ہندوؤں کو مسلمان قتل کر رہے ہیں اور مسلمانوں کو ہندو مار رہے ہیں۔ وہ مومنہ سے پوچھتا ہے کہ تم کو لوٹنے والے لوگ ہندو تھے؟ مومنہ کہتی ہے کہ اس کا گھر دہلی کے قریب تھا، ہندوؤں نے میرے ماں، باپ، بھائی، بہن اور دودھ پیتی بچی کو بے دردی سے قتل کر دیا اور جوان بہن ''مہرن'' کو اٹھا لے گئے۔ پھر وہ کہتا ہے ماں تم کتنی اچھی ہو اگر تم چاہتی تو مجھ سے بدلہ لے سکتی تھی لیکن تمہارے اندر صرف دیا ہے۔ ماں اب میں کسی سے بدلہ نہیں لوں گا بس اپنی بہن مہرن کو ڈھونڈ کر لاؤں گا۔ وہ کہتا ہے کہ اگر میں مر گیا تو میرا دکھ مت کرنا تبھی مجھے شانتی ملے گی اور میری بہن مہرن کے ساتھ میری ماں پریما اور بابا سورج پرشاد جس کو مسلمان اٹھا لے گئے ان کو بھی ڈھونڈ نکالنا۔ مومنہ نے صبر کا وعدہ اور دلاسہ دیا۔ میں تمہارے ماں باپ کو کھوج نکالونگی اور جتنا پیار میں تم سے کرتی ہوں اتنا پیار میں پریما سے بھی کروں گی۔ مومنہ کی محبت نے رامو کی نفرت کو پیار میں بدل دیا۔ اس کے ساتھ ہی رامو دنیا سے رخصت ہو گیا۔ اس کے آخری الفاظ یہ تھے:

''ایک بات اور ہے ماں۔ تمہارا جی چاہے تو مجھے دفن کر دینا میں تمہارا ہی بیٹا ہوں۔ ایشور کرے دوسرے جنم میں تم ہی سے پیدا ہوں۔ اور تم ہی مجھے پالو پوسو۔'' [۱۵]

مومنہ کے اندر اس کو جلانے یا دفنانے کی طاقت نہ تھی۔ وہ مردہ جسم کو بیٹھک میں رکھ کر دیوار پر یہ الفاظ لکھ کر چلی گئی:

''یہ لاش رامو کی ہے۔ وہ ہندو تھا۔ لیکن اس کی ماں مومنہ مسلمان تھی۔ اگر یہاں کوئی مسلمان آئیں تو اسے دفن کر دیں۔ ہندو آئیں تو پھونک دیں۔ مومنہ اگر زندہ بچی تو یہ احسان کرنے والے کا شکریہ ادا کرنے یہاں ایک بار ضرور آئے گی۔'' [۱۶]

افسانہ نگار نے رامو اور مومنہ کے کردار کے ذریعے انسانیت کے کا مذہب کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

حیات اللہ انصاری کو انسانی نفسیات سے واقفیت ہے، بچوں کی نفسیات پر بھی ان کو مکمل عبور حاصل ہے۔ان کے افسانوں میں فن، تکنیک اور موضوعات کا تنوع پایا جاتا ہے۔اسلوب کی وجہ سے وہ افسانوی ادب کی دنیا میں ہمیشہ ایک ستارے کی طرح چمکتے رہیں گے۔

حوالہ

(۱) اکادمی، حیات اللہ انصاری نمبر نومبر ۲۰۰۰ تا دسمبر ۲۰۰۱، ص ۹۶

(۲) ترقی پسند تحریک اور اردو افسانہ 1936 سے 1965 تک، ڈاکٹر صادق (ص، ۱۷۰)

(۳)۔ایضاً، ص ۱۶۸

(۴) حیات اللہ انصاری کی کہانی کائنات مرتب ڈاکٹر عشرت ناہید ص ۴۹ (بڈھا سود خوار)

(۵)۔ایضاً، ص ۵۳

(۶)۔ایضاً، ص ۵۵

(۷)۔ایضاً، ص ۵۰

(۸)۔ایضاً، ص ۴۹

(۹)۔ایضاً، ص ۲۸۹ (بھیک)

(۱۰)۔ایضاً، ص ۲۹۱

(۱۱)۔ایضاً، ص ۲۱۴ (موزوں کا کارخانہ)

(۱۲)۔ایضاً، ص ۲۱۷

(۱۳)۔ایضاً، ص ۲۱۸

(۱۴)۔ایضاً، ص ۲۷۶ (ماں بیٹا)

(۱۵)۔ایضاً، ص ۲۸۴

(۱۶)۔ایضاً، ص ۲۸۴

عبدالمنان صمدی۔ نگلہ ملاح سول لائن علی گڑھ (یوپی)

غزل

جو بکھرا ہے اسے یکجا دوبار کیوں کیا جائے
محبت ہوگئی پھر سے یہ دعوی کیوں کیا جائے

نہ ان کو آرزو میری نہ مجھ کو جستجو ان کی
تعلق جب نہیں کوئی تماشا کیوں کیا جائے

نہیں ممکن سفر کرنا کسی کاغذ کی کشتی پر
تو ایسا احمقانہ پھر ارادہ کیوں کیا جائے

لکیروں میں لکھا ہے جب کہ ہے قسمت نہیں الفت
کسی کی جستجو میں خود کو رسوا کیوں کیا جائے

ارادہ ہی نہیں ان کا ہمارے ساتھ رہنے کا
تو ان سے ساتھ رہنے کا تقاضا کیوں کیا جائے

مدرسہ اسلامیہ نجم العلوم (اقامتی وغیر اقامتی ادارہ)

شاہی ہلز شاہین نگر حیدر آباد

زیر انتظام: شبلی انٹرنیشنل ایجوکیشنل ٹرسٹ حیدر آباد

Ac No: 1327104000065876 Bank Name: IDBI
AcN: SHIBLI INTERNATIONAL ADUCATIONAL AND CHARITABLE TRUST
IFS: IBL0001327. Branch: Charminar Hyderabad (T.S)

بانی وناظم: مولانا ڈاکٹر مفتی محمد محامد ہلال اعظمی۔ موبائل: 9392533661

محمد نہال افروز۔ ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

واٹر

واٹر یعنی کہ پانی۔ پانی یعنی کہ زندگی۔ زندگی تو بیوی ہوتی ہے۔ بیوی تو انسان کی زندگی تباہ بھی کرتی ہے۔ تباہ تو ہندوستان ہو رہا ہے۔ ہندوستان جو آزاد ہو چکا ہے۔ آزادی تو ہمیں انگریزوں سے ملی ہے۔ انگریز وہ ہیں جو نئی چیزیں ایجاد کرتے ہیں۔ نئی چیز تو گراہم بیل نے بھی ایجاد کی تھی۔ گراہم بیل نے ٹیلی فون ایجاد کیا تھا۔ ٹیلی فون سب سے اچھا نوکیا کا ہوتا ہے۔ اچھا تو موسم بھی ہوتا ہے۔ موسم پانچ طرح کے ہوتے ہیں۔ ٹھنڈی کا موسم، گرمی کا موسم، بارش کا موسم، خزاں کا موسم اور بہار کا موسم۔ بارش کے موسم میں آسمان سے پانی برستا ہے اور پانی ہی کو انگریزی میں واٹر کہتے ہیں۔

واٹر یعنی کہ پانی۔ پانی واٹر ٹینک میں بھرا جاتا ہے۔ ٹینک تو ہماری فوج میں بھی ہوتے ہیں، لیکن اس میں واٹر نہیں بھرا جاتا۔ واٹر یعنی کہ پانی۔ پانی دو طرح کا ہوتا ہے۔ ایک صاف پانی اور ایک گندا پانی۔ گندے پانی میں کنول کھلتا ہے۔ کنول ایک پھول ہوتا ہے۔ پھول تو گلاب کا بھی ہوتا ہے۔ گلاب کے پھول سے گل قند بنتا ہے۔ گل قند پیٹ صاف کرتا ہے۔ پیٹ تو خربوزہ بھی صاف کرتا ہے۔ خربوزہ خربوزے کو دیکھ کر رنگ بدلتا ہے۔ رنگ سب سے اچھے جرمنی کے ہوتے ہیں۔ جرمنی وہ جہاں کا ہٹلر تھا۔ ہٹلر وہ تھا، جس نے وار کی تھی۔ وار آٹھ طرح کے ہوتے ہیں۔ سوم وار، منگل وار، بدھ وار، برہسپتی وار، شکر وار، شنی وار، روی وار اور ورلڈ وار۔ ورلڈ یعنی کہ دنیا۔ دنیا گول ہوتی ہے۔ گول تو رس گلہ بھی ہوتا ہے۔ رس گلہ کھانے سے پیاس لگتی ہے۔ پیاس کو پانی بجھاتا ہے اور پانی ہی کو انگریزی میں واٹر کہتے ہیں۔

واٹر یعنی کہ پانی۔ پانی ہر جاندار کے لیے آب حیات ہوتا ہے۔ آب حیات کے مصنف محمد حسین آزاد ہیں۔ محمد حسین آزاد اردو کے بہت بڑے مصنف گزرے ہیں۔ بڑے تو میرؔ، غالبؔ اور اقبالؔ بھی تھے، لیکن یہ سب بھی گزر گئے۔ گزرتو ایک دن سب جائیں گے۔ دن رات کے بعد ہوتا ہے اور رات اندھیری ہوتی ہے۔ اندھیرے میں کتے بھونکتے ہیں۔ کتے وفادار ہوتے ہیں۔ وفادار تو مسلمان بھی ہوا کرتے تھے، لیکن ان سے یہ وفاداری دوسروں نے سیکھ لی اور یہ بھول گئے۔ دوسرے تو غیر ہوتے ہیں۔ غیروں پہ اپنا راز نہیں کھولنا چاہیے۔ راز تو گنگا، جمنا اور سرسوتی میں چھپا ہوا ہے۔ گنگا، جمنا اور سرسوتی تینوں ندیاں ہیں۔ ندیوں میں پانی ہوتا ہے اور پانی ہی کو انگریزی میں واٹر کہتے ہیں۔

واٹر یعنی کہ پانی۔ پانی دنیا کا ایک تہائی حصہ گھیرے ہوئے ہے۔ دنیا انسانوں سے بھری پڑی ہے۔ پڑا تو آدمی شراب پی کر بھی رہتا ہے۔ شراب انتہائی بری چیز ہے۔ اچھی شراب جنت میں ملے گی۔ جنت میں تو حوریں بھی ملیں گی۔ حور پری کو کہتے ہیں۔ پری بہت خوبصورت ہوتی ہے۔ خوبصورت تو یوسف علیہ السلام تھے۔ یوسف علیہ السلام اللہ کے نبی تھے۔ اللہ کے نبی تو آپ ﷺ بھی ہیں۔ آپ ﷺ ہی کے صدقے میں یہ پوری کائنات بنی۔ کائنات کا خالق اللہ ہے۔ اللہ کے رسول محمد ﷺ ہیں۔ محمد ﷺ کے ہم سب امتی ہیں۔ امت تو ہر نبی کی تھی، لیکن سب سے افضل امت محمد رسول ﷺ کی ہے۔ افضل تو ہر وہ انسان ہے جو صوم وصلاۃ کا پابند ہے۔ پابند انسان بہت ہی نیک ہوتے ہیں۔ نیک تو پہلے ابلیس بھی تھا۔ ابلیس شیطان کو کہتے ہیں۔ شیطان کی آنکھیں

ڈراونی اور لال ہوتی ہیں۔لال تو ٹماٹر بھی ہوتا ہے۔لال ٹماٹر دیکھ کر منھ میں پانی آجاتا ہے اور پانی ہی کو انگریزی میں واٹر کہتے ہیں۔

واٹر یعنی کہ پانی۔پانی کی مختلف شکلیں ہوتی ہیں۔ جیسے برف، شبنم، اوس، بھاپ، بارش، کہرہ، پھوارا وغیرہ۔شکلیں تو انسانوں کی بھی مختلف ہوتی ہیں۔انسان اشرف المخلوقات ہے۔ اشرف المخلوقات ساری مخلوق سے بزرگ تر کو کہتے ہیں۔بزرگ عالم دین کو کہتے ہیں۔عالم دین وہ ہوتا ہے، جو دین کا سبق دیتا ہے۔سبق تو اسکولوں میں بھی پڑھایا جاتا ہے۔پڑھ لکھ کر لوگ اچھے انسان بنتے ہیں۔اچھی تو جنت ہوتی ہے۔جنت میں آب کوثر پینے کے لیے ملے گا۔کوثر جنت کی ایک نہر کا نام ہے۔نہر میں پانی ہوتا ہے اور پانی ہی کو انگریزی میں واٹر کہتے ہیں۔

واٹر یعنی کہ پانی۔پانی انسانی جسم کے تمام اعضا کو فعال رکھنے میں نہایت اہم کردار ادا کرتا ہے۔کردار تو افسانوں میں ہوتے ہیں۔افسانہ جھوٹی سچی کہانیوں کو کہتے ہیں۔کہانیاں تو بچپن میں دادی نانی سنایا کرتی تھیں۔بچپن بہت ہی معصوم ہوتا ہے۔معصوم تو راہی معصوم رضا تھے۔رضا تو یوسف رضا گیلانی ہیں۔یوسف رضا گیلانی پاکستان کے سابق وزیر اعظم ہیں۔وزیر اعظم ملک کا بادشاہ ہوتا ہے۔بادشاہ تو اکبر بھی تھا۔اکبر بادشاہ کا قلعہ الہ آباد میں ہے۔الہ آباد میں تو سنگم بھی ہے۔سنگم گنگا اور جمنا کے ملنے کو کہتے ہیں۔گنگا اور جمنا ہندوستان کی دو بڑی ندیاں ہیں۔ان ندیوں میں ہمیشہ پانی رہتا ہے اور پانی ہی کو انگریزی میں واٹر کہتے ہیں۔

واٹر یعنی کہ پانی۔پانی کی کمی سے انسان کو بہت ساری بیماریاں لگ جاتی ہیں۔بیماری بھی ایک طرح سے اللہ کی نعمت ہے۔ نعمت تو اللہ کی دی ہوئی ہر چیز ہے۔چیز کو اردو میں پنیر کہتے ہیں۔پنیر دودھ سے بنتا ہے۔دودھ گائے دیتی ہے۔گائے ایک پالتو جانور ہے۔پالتو جانور تو کتا بھی ہوتا ہے۔کتے رات میں چوکیداری کرتے ہیں۔چوکیداری تو آدمی بھی کرتے ہیں۔آدمی اب تو آدمی کا آدمی ہونے لگا ہے۔آدمی آدمؑ کی ذات کو کہتے ہیں۔آدمؑ دنیا کے پہلے انسان تھے۔انسان بلبلے کے طرح ہوتا ہے۔بلبلے پانی میں اٹھتے ہیں اور پانی ہی کو انگریزی میں واٹر کہتے ہیں۔

مسیح الدین نذیریؔ۔پورہ معروف مئوناتھ بھنجن یوپی

غزل

میں سارے زہر میں ڈوبے شگوفے یاد رکھتا ہوں
پرانے ہوں تو کیا میں سارے قصے یاد رکھتا ہوں

مجھے اب مت سناؤ خوشنما قصے محبت کے
میں سب کچھ بھولتا ہوں تلخ لمحے یاد رکھتا ہوں

بھٹکتا ہوں میں دن بھر دھوپ میں تھکتا نہیں پھر بھی
کہ گھر میں بھوک سے بے حال بچے یاد رکھتا ہوں

لگاتا ہوں گلے دشمن کبھی جب جھک کے ملتا ہے
کہ میں اپنے بزرگوں کے طریقے یاد رکھتا ہوں

اگرچہ ان کو دہراتا نہیں لیکن حقیقت ہے
میں اپنے دوستوں کے سارے طعنے یاد رکھتا ہوں

مرا دشمن یہیں پہ آکے مجھ سے ہار جاتا ہے
کہ میں انسانیت کے سارے رشتے یاد رکھتا ہوں

بھلانے سے نذیریؔ سارا ماضی چھوٹ جاتا ہے
تو میں اس واسطے ماضی کے رستے یاد رکھتا ہوں

سیدہ تبسم منظور ناڈکر۔ممبئی

تصویر کے دو پہلو

دور حاضر الیکٹرانک میڈیا کا ہے اور یہ ہم پر منحصر ہے کہ ہم اس کا استعمال کس لئے اور کس طرح کرتے ہیں۔۔۔اس میں اچھائی بھی ہے اور برائی بھی ہے۔سوشل میڈیا کا کردار بہت نمایاں ہوگیا ہے اس وجہ سے بچے۔۔۔۔ جوان۔۔۔بزرگ۔۔۔عورت ومرد سبھی لوگ اس سے جڑ گئے ہیں اور اسے چوبیس گھنٹوں کا اپنا ساتھی بنالیا ہے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ سوشل میڈیا واٹسیپ، فیس بک، یوٹیوب اور دیگر ویب سائٹس کے بے شمار فائدے ہیں۔ان کی وجہ سے آج دنیا سمٹ کر مٹھی میں آگئی ہے،خبروں کی ترسیل، معلومات کی فراہمی، سماجی ومعاشی معاملات حتی کہ قوم ومذہب کا فروغ سب کچھ بلکل آسان سے آسان تر ہوگیا ہے۔جن خبروں کو پہنچنے میں مہینوں لگتے تھے، خط لکھنے اور پہنچنے میں مہینہ درکار ہوتا آج سیکنڈ میں بات ایک دوسرے تک پہنچ جاتی ہے۔لوگ ایک دوسرے کو دیکھنے کے لئے ترس جاتے تھے آج ویڈیو کالنگ سے ایک دوسرے کو دیکھا جا سکتا ہے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ حقیقت بھی ہے کہ ان سماجی رابطوں نے سماج ومعاشرے پر برائی کے بہت ہی گہرے اثرات بھی چھوڑے ہیں۔جن کی لپیٹ میں نوجوان لڑکے اور لڑکیوں سے لیکر بچے بچیاں اور عمر دراز لوگ تک ہیں۔اس جدید دور میں ہمارے پاس معلومات اور پیغامات کا ایک ہجوم ہے جو ہر جگہ پھیلتا چلا جارہا ہے۔محض ایک کلک پر دنیا جہاں کی معلومات آپ کے سامنے ہوتیں ہیں۔ ہم اس ہجوم میں اس قدر الجھ گئے ہیں کہ ہمارے اقدار ہمارا علم اور ہماری تخلیقی صلاحیتیں بالکل ختم ہوتی جارہی ہیں۔ ہماری نوجوان نسل اسی وجہ سے اپنی زندگی کے مقصد کو بھولتی جارہی ہے۔ایک ہی گھر میں رہنے والے لوگ ایک دوسرے کی خبر نہیں رکھ پاتے لیکن سات سمندر پار بیٹھے دوستوں سے واقف ہوتے ہیں ان کو پیغامات بھیجتے ضرور نظر آتے ہیں۔گھر میں کس کو کیا تکلیف ہے اس سے بے خبر ہیں۔

انٹرنیٹ اور سوشل میڈیا ویب سائیٹس کی افادیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا سوشل میڈیا کی وجہ سے آج فاصلے سمٹ کر کم ہوگئے ہیں۔ ہزاروں میل دور سے انسان اپنے سارے مسئلے گھر بیٹھ کر حل کرسکتا ہے۔سوشل میڈیا کی بدولت آج دنیا میں فیس بک۔۔موبائل ایس ایم ایس، واٹسیپ فوری طور پر ملنے والی عوامی خبروں کی ویب سائیٹس ہیں۔گذشتہ چند سالوں کے دوران سوشل میڈیا کے صارفین میں بہت اضافہ ہوا ہے اور وقت کے ساتھ ساتھ مزید اور بڑھ بھی رہا ہے مگر جس طرح ہر چیز کے مثبت اور منفی دونوں پہلو ہوتے ہیں۔ایسا ہی حال سوشل میڈیا کا بھی ہے جہاں سوشل ویب سائیٹس انفرادی سطح پر باہمی رابطوں کا ذریعہ اور اطلاعات اور خبروں کی ترسیل کا اہم ترین وسیلہ بن کر سامنے آئی ہے، وہیں ان کی وجہ سے معاشرے میں بہت سی اخلاقی اور سماجی خرابیوں نے بھی جنم لیا ہے۔ایسے معاشرے میں ہم بھی ہیں۔ جہاں ہر ٹیکنالوجی کے منفی اثرات۔۔۔مثبت اثرات سے کہیں زیادہ ہو رہے ہیں۔سوشل میڈیا کی کئی ویب سائیٹس ہیں۔جس میں فیس بک کی اہم مثال ہے جو کچھ وقت پہلے تک خبروں کے پھیلانے اور علم حصول میں اہم ترین ذریعہ تھیں۔مگر آج ہمارے سماج میں

کئی افراد ایسے ہیں جو ان سائیٹس کا غلط طور پر استعمال کرتے ہیں۔لوگوں کو بدنام۔۔۔من گھڑت خبریں اور فحش ویڈیو اور تصاویر پھیلانے میں اور تصویروں کو چھیڑ چھاڑ کر کے لوگوں کو بلیک میل کرنے کے لئے استعمال کرتے ہیں۔

سماجی رابطوں کی ویب سائیٹس نے بچوں کو سب سے زیادہ متاثر کیا ہے۔ان کی جذباتی اور ذہنی صحت متاثر ہورہی ہے۔روزانہ اپنا زیادہ وقت سوشل میڈیا پر گزارنے والے بچوں میں جذباتی مسائل، ہائپر ٹینشن اور خراب رویہ پیدا ہوجاتا ہے۔اس کی وجہ آج کے دور میں بچوں نے اپنی تعلیم اور کتابوں سے زیادہ سوشل میڈیا میں دلچسپی لی ہے۔ایک دور تھا جب بچے اسکول جاتے اور پھر گھر آکر اپنی پڑھائی پر توجہ دیتے تھے اور کچھ وقت کھیل کود کو دیا کرتے تھے۔کہانیوں کی کتابیں۔۔۔قرآن وحدیث کی کتابیں پڑھا کرتے۔۔۔جس سے وہ ذہنی اور جسمانی طور پر تندرست رہتے۔مگر جب سے انٹرنیٹ، موبائل کے ذریعے سوشل میڈیا آبسا ہے تب سے کھیل کود آؤٹ ڈور گیم کھیلنا ہی بند ہوگئے۔موبائل پر نہ جانے کئی طرح کے گیم ڈاؤن لوڈ کر کے کھیلے جاتے ہیں۔بس سال میں ایک بار اسکول میں اسپورٹس ہوتے ہیں۔ سب سے زیادہ متاثر نوجوان نسل اور کم عمر بچے ہورہے ہیں۔آج بچے اپنا سارا وقت موبائل اور کمپیوٹر کے استعمال میں صرف کردیتے ہیں۔جس کی وجہ سے ان کی تعلیم متاثر ہورہی ہے۔کئی نوجوان توفیک آئی ڈیز کے ذریعے کالج اور اسکول کی لڑکیوں کی تصاویر لگا کر معصوم لڑکیوں کو بیوقوف بناتے ہیں اور اپنے انجوائمنٹ کے لئے اپنا اور دوسروں کا وقت بھی برباد کررہے ہیں۔۔۔دوسروں کے جذبات اور احساسات سے کھیل کر خوشی محسوس کرتے ہیں، تو دوسری طرف زیادہ تر لڑکیاں فلمی اداکاراؤں یا ماڈلز کی خوبصورت تصویریں لگا کر لڑکوں کو متاثر کرنے کوشش میں مصروف رہتی ہیں اور پھر کسی کے ساتھ محبت کے جھانسے میں پھنس کر مسائل کا شکار ہوجاتی ہیں۔کیونکہ لڑکے صرف دل لگی کر رہے ہوتے ہیں۔ اور دوستی کے نتیجے میں ملاقات کے بہانے بہت سی لڑکیاں جنسی زیادتی کا بھی شکار ہوجاتی ہیں۔آج کیونکہ سوشل میڈیا کی بدولت جنسی ویب سائٹس تک رسائی آسان ہوچکی ہے لہذا نوعمر بچے خاص طور پر لڑکے اخلاقی اور جنسی بے راہ روی کا شکار ہورہے ہیں۔وہ اپنا سارا وقت سوشل میڈیا پر گزارتے ہیں۔جس کی وجہ سے اپنی ذہنی اور جسمانی صحت خراب کر بیٹھتے ہیں۔اس کے علاوہ سوشل میڈیا پر ہر قسم کی معلومات شئر کرنے کے بھی بہت خراب نتائج سامنے آرہے ہیں۔لوگوں میں نفرت، بدلہ، حسد اور جلن جیسے مضر اثرات پیدا ہورہے ہیں۔بچوں کا مستقبل تاریک ہورہا ہے۔بچوں کے معاملے میں لاپروائی کے زمیدار والدین ہیں جو اپنے بچوں کو موبائل اور کمپیوٹر کا زیادہ استعمال کرنے سے نہیں روکتے اور نہ ہی ان پر نظر رکھتے ہیں۔۔۔نہ انہیں وقت کا پابند بناتے ہیں۔۔۔نہ یہ دیکھتے ہیں کہ بچے اپنا سارا وقت کیوں اور کہا گزار رہے ہیں۔

غرض سوشل میڈیا کا استعمال لوگوں کو جہاں فائدہ پہنچا رہا ہے وہیں بہت سی اخلاقی اور معاشرتی برائیوں میں بھی مبتلا کررہا ہے لوگوں کی زندگی سے سکون ختم کرنے کا اہم سبب بن رہا ہے۔ضرورت تو اس امر کی ہے کہ ہر شخص اس کا استعمال اعتدال میں رہ کر کرنا سیکھے اور خود کو ان چیزوں کا عادی بنانے کے بجائے صرف ضرورت کے تحت ان سے فائدہ اٹھانے کے لئے استعمال کریں، اس طرح سے ہر قسم کی پریشانی پر قابو پایا جاسکتا ہے۔بچوں کو بچپن سے ہی اسلامی تربیت سے آراستہ کرنا اور ان کے اخلاق وکردار کو پروان چڑھانا ضروری ہے۔

ماہرین نفسیات کا کہنا ہے کہ بچپن کے ابتدائی ایام میں ہی ذہنی نشوونما وجسمانی صلاحیتیں تیزی سے پروان چڑھتی ہیں۔اس عمر میں بچے ہر سنی سنائی بات اپنے ذہن میں محفوظ کرتے ہیں۔۔۔آنکھوں سے دیکھا ہوا پتھر پر نقش کی طرح ہوتا ہے اور تیزی سے نئی نئی باتیں سیکھنے لگتے ہیں۔بچپن کے اسی مرحلے پر مستقبل کا دارومدار ہوتا۔شوشل میڈیا کا استعمال ضرورت کے لحاظ سے کریں تو فائدہ مند ہوسکتا ہے۔

دفتر شبلی انٹرنیشنل ایجوکیشنل ٹرسٹ حیدرآباد میں
آئین ہند کی اہمیت وافادیت کے عنوان سے مذاکرہ

یوم جمہوریہ کے موقع پر ایک علمی اور فکری مذاکرہ بعنوان آئین ہند کی اہمیت وافادیت کا انعقاد شبلی انٹرنیشنل ایجوکیشنل ٹرسٹ کی جانب سے پرانی حویلی حیدرآباد میں کیا گیا جس کی سرپرستی استاذ الاساتذہ حضرت رحمٰن جامی نے کی اور مہمان خصوصی جسٹس ای اسماعیل صاحب، ایس کے افضل الدین ڈاکٹر ناظم علی، ڈاکٹر انصاری اور صدارت ڈاکٹر مختار احمد فردین نے فرمائی۔

پروگرام کو خطاب کرتے ہوئے جسٹس ای اسماعیل نے کہا کہ یوم جمہوریہ ہند کے موقع پر آئین ہند کی اہمیت پر گفتگو کرنا ضروری ہے، تاکہ ہم ہندوستان کے قوانین سے آگاہ ہوسکیں، ہمارے ملک کا آئین سب کے لئے یکساں ہے، ہر ایک کو اپنے مذہب پر عمل کرنے اور اس کو فروغ دینے کی آزادی ہے، لیکن بدقسمتی سے دورِ حاضر میں مسلمانوں کے خلاف ایسے قانون بنائے جارہے ہیں، جو شریعت سے متصادم ہیں، ای اسماعیل نے طلاقِ ثلاثہ کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ اس قانون کے بننے کی وجوہات کے ذمہ دار کہیں نہ کہیں ہم بھی ہیں، ہم طلاق کا غلط استعمال کررہے ہیں، اس لئے ہمیں نکاح سے پہلے ہی شادی کے بعد کی ازدواجی زندگی کو سیکھنا اور سیکھانا چاہئے، قرآن نے میاں بیوی کے مسائل بحسن خوبی سلجھانے کی بات کی ہے، اس لئے شادی سے پہلے ہی اس کی تعلیمات سمجھنا چاہئے۔

ڈاکٹر ناظم علی نے کہا کہ ہمارے ملک کا دستور کوئی نیا نہیں ہے، ہمارے آئین میں جس طرح مساوات کو اہمیت دی گئی ہے، اس سے چودہ سو سال پہلے ہی مذہب اسلام نے نظام زندگی کا جو درس دیا ہے، وہ کسی مذہب نے نہیں دیا ہے، ہمارے ملک کا آئین ہمارے اسلام ہی سے لیا گیا ہے۔

استاذ الشعراء رحمٰن جامی نے کہا کہ ملک کو ایک آزاد ریاست بنانے میں، اردو زبان نے بہت بڑا کارنامہ انجام دیا ہے، اس لئے ہمیں چاہئے کہ اس پیاری اور شیریں زبان کو خود بھی سیکھیں اور دوسروں بھی کو سیکھائیں،

اگر ہمارے بچے یا دیگر لوگ اردو سے ناواقف ہیں، تو ان کو روزانہ اردو کا ایک لفظ پڑھنا اور لکھنا سیکھائیں، ان شاء اللہ چند عرصے میں وہ ایک محرر اور مقرر بن کر تیار ہوجائے گا۔

ڈاکٹر غوثیہ بانو نے آئین ہند اور جمہوریت کی خصوصیت بیان کرتے ہوئے انسانی ہمدردی کے ایک واقعہ کی مثال دے کر کہا کہ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ آج بھی جمہوریت زندہ ہے۔

مولانا ڈاکٹر حمران احمد معروفی نے جنگِ آزادی سے لے کر دستورِ ہند کی تشکیل تک کی پوری تاریخ پر روشنی ڈالی، بطورِ خاص جنگ آزادی میں علماء کرام کے کردار کا تذکرہ کیا، جن کی قربانیوں کو آج فراموش کیا جارہا ہے۔ آئین ہند کے نفاذ میں رول ادا کرنے والے دانشوران کا بھی انہوں ذکر کیا۔

ڈاکٹر مختار احمد فردین نے کہا کہ یوم جمہوریہ کے موقع پر ہم عزم کریں کہ ہم اپنے آئین اور جمہوریت کی مضبوطی سے حفاظت کریں گے، اس کے تحفظ کے لئے ہمیں نئی نسل کو تیار کرنا انتہائی ضروری ہے، اس لئے نسلِ نو ہی ہمارے ملک کے مستقبل کے معمار ہیں، جب ہم نئی نسل کو ہر اعتبار سے منزلِ فلاح و بہبود کی جانب پہنچائیں گے، تو ملک مزید ترقیوں سے ہمکنار ہوگا۔

ڈاکٹر محمد ہلال اعظمی نے کہا کہ آئینہ ہند میں بڑی وسعت ہے اس کو پڑھنے سمجھنے عمل کرنے اور صحیح طریقے سے اس کے استعمال کی ضرورت ہے، لیکن بدقسمتی سے ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں اس وقت ملک کی باگ ڈور ہے جو اصول گلستاں سے واقف ہی نہیں ہیں۔

ایس کے افضل الدین کانگریس لیڈر نے کہا کہ جن لوگوں نے ملک کی جمہوریت کی بقا میں حصہ لیا، ان کی حمایت کرنی چاہئے، اور ان کے مشن مسلسل کو آگے بڑھانے میں اپنا کردار ادا کرنا چاہئے، اس موقع پر انہوں نے اردو زبان وادب کے فروغ میں حصہ لینے پر زور دیا۔

اس موقع پر عمدۃ الشعراء ایوارڈ حضرت رحمٰن جامی کی خدمت میں پیش کیا گیا اور مہمان کا شال پوشی اور گل پوشی سے استقبال کیا گیا۔ ماہنامہ صدائے شبلی جنوری کے شمارہ کا رسم اجرا عمل میں آیا۔

ڈاکٹر محمد رفیق ڈاکٹر، عبدالقدوس، ڈاکٹر سراج احمد انصاری، ڈاکٹر فضیل احمد ندوی، مولانا حافظ اکرام الدین، ڈاکٹر غوثیہ بانو، ابوھریرہ یوسفی، نور فاطمہ وغیرہ شریک رہے اور ٹرسٹ کے چیرمین صدائے شبلی کے ایڈیٹر ڈاکٹر محمد محمد ہلال اعظمی نے نظامت اور ھدیہ تشکر پیش کیا اور یوم جمہوریہ کی مبارک باد دی۔

شاہ جلیل الحق قادری بقاء

حضرت شاہ جلیل الحق قادری بقاء کرناٹک کے بلہار کے رہنے والے تھے۔ حضرت بقا مشیتِ الٰہی کے مطابق موضع بھونگیر محلّہ بیدہٹھہ تشریف لائے، حضرت بقاء صوفی منش انسان تھے، آپ کی مکمل زندگی تبلیغِ اسلام وصوفی ازم کی خدمت میں گزری، جیسا کہ دنیا کا دستور ہے کہ حق پرست کی ہمیشہ ابتداء میں مخالفت کی جاتی رہی، اسی طرح محلّہ بلہار سٹھہ کے مسلمان بھی حضرت بقاء کی خدمت خلق واشاعتِ اسلام سنت نبوی کی پابندی کی تبلیغ پر مخالفت شروع کردیا۔ حضرت بقاء بلہار سٹھہ کے مسلمانوں کے رویے سے مایوس ہوکر موجودہ حیدرآباد چوراستہ پر آکر بیٹھ گئے۔ محلّہ بلہار سٹھہ کے محلّہ کے قریب تاجران چرم کا محلّہ آباد تھا، جب یہ خبر تاجران چرم تک پہنچی تو جناب چودھری عبدالحی صاحب اور دیگر حضرت بقاء کو اپنے محلے میں لے آئے، جہاں ایک عاشور خانہ تھا، حضرت نے اس میں قیام کیا اور اس میں مسجد قائم کی گئی حضرت کے علم وفضل سے ہزاروں کی زندگیوں میں انقلاب آگیا اور دیکھتے ہی دیکھتے تاجران چرم کی برادری کے لوگ آپ کے معتقد ہوگئے اور آپ کے نام نامی اسم گرامی پر ہی اس محلّہ کا نام جلیل پورہ رکھا گیا اور اس عاشور خانہ کو مسجد میں تبدیل کردیا۔ حضرت کی تبلیغ وفیضان سے لوگ شریعتِ مطہرہ وسنتِ رسولؐ پر گامزن ہوتے ہوگئے۔ حضرت بقاء نیم کے پتوں کا عرق نکال کر بڑے مزے سے پیتے اور اپنے مریدوں کو بھی پلاتے، آج بھی برادری تاجران چرم میں غیر شرعی رسومات نہیں کی جاتی ہے، باجے کی سختی سے ممانعت ہے، آج بھی شادی میں سہرا نہیں باندھا جاتا۔ الحمدللہ آج چھوٹا سا عاشور خانہ وسیع وعریض مسجد میں تبدیل ہوگیا اور مسجد کا نام صحابہ رکھا گیا، مسجد کے سامنے ایک دینی مدرسہ قائم کیا گیا، جو حضرت بقاء کی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ آج یہ مدرسہ قدیم جامعہ اسلامیہ عربیہ محل ململ پورے بھی جاری وساری ہے، بہت سارے طلباء وطالبات اس میں علم سے سیراب ہورہے ہیں۔

سالانہ ۲۸ رشعبان کو حضرت بقاء کی فاتحہ عقیدت واحترام سے منائی جاتی ہے اور ایک عظیم الشان جلسہ فیضان اولیاء کا انعقاد بھی کیا جاتا ہے۔

قارئین کے خطوط

☆ مکرمی سلام مسنون

نائب مدیر جناب ابو ہریرہ یوسفی صاحب کے ذریعے ''ماہنامہ صدائے شبلی'' کا دوشمارہ ملا، ایڈیٹر جناب ڈاکٹر محامد ہلال صاحب کی ادارت میں رسالہ ترقی کی منزلیں طے کررہا ہے، کیوں کہ مدیر اور نائب مدیر کی ادارتی مہارت اور علمی وادبی ذوق کے ساتھ مجلس ادارت میں جب جید جید ماہر قلم کار اور ڈاکٹر صاحبان موجود ہوں؛ جن میں ہمارے دوست ڈاکٹر حمران صاحب جیسے مستعد اور فعال شخص ہوں تو یقیناً اس رسالہ کی دن دونی رات چوگنی ترقی وکامرانی کی پیش گوئی کی جاسکتی ہے۔

مضامین کے انتخاب نے ڈاکٹر محامد ہلال صاحب نے اپنے تجربات کے خوب جوہر دکھائے ہیں، اسی لیے اس میں دینی، ادبی، سائنسی مضامین کی شمولیت کے دوش بدوش اسلامی اور انگریزی مہینوں کی مناسبت سے بھی مضامین کو بھی جگہ دی گئی ہے، میرا مضمون ''ایمن کی شاعری'' آپ نے شائع کیا، اس کا میں شکر گزار ہوں، ایک مضمون ''کتابوں کا ذوق'' اس کے علاوہ کئی اور مضمون، نیز غزلیں اس خط کے ہمراہ ارسال ہیں، اگر رسالہ کے معیار کے مطابق ہوں تو شائع فرمانے کی زحمت فرمائیں۔

انصار احمد معروفی

پورہ معروف مئوناتھ بھنجن (یوپی)

مولانا انصار احمد صاحب! ہم آپ کے بیحد ممنون ہیں کہ آپ نے رسالہ کا مطالعہ کیا اور اس کی پذیرائی کی، آپ کی نگارشات ہمیں موصول ہوئیں، جس کو ہم نے گذشتہ شمارے میں شائع کیا ہے، مزید آئندہ شائع کرنے کی کوشش کریں گے۔ آپ نے ہمیں خط لکھا، اس کے لیے آپ کا بہت بہت شکریہ

☆ مکرمی ومحترمی جناب ڈاکٹر محمد محامد ہلال اعظمی صاحب!

ایڈیٹر ماہنامہ صدائے شبلی حیدرآباد

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

امید کہ مزاج بخیر ہوگا

میں سب سے پہلے آپ کو اس بات کی مبارکباد پیش کرنا چاہتا ہوں کہ آپ نے علامہ شبلی نعمانیؒ جیسی جلیل القدر شخصیت کے افکار وخیالات کو منظر عام پر لانے کی غرض سے حیدرآباد کی زرخیز سرزمین پر شبلی انٹرنیشنل ایجوکیشنل ٹرسٹ قائم فرمایا اور دوسری جانب اس کے زیر اہتمام بڑی پابندی کے ساتھ صدائے شبلی کے نام سے ایک میگزین بھی نکال رہے ہیں۔

میں نے ماہِ جنوری ۲۰۱۹ء کا شمارہ بالاستیعاب پڑھا، اس کے ہر مضمون سے اردو کی خوشبو محسوس ہوتی ہے۔ اللہ کرے کہ یہ خوشبو ہر چہار جانب پھیلے۔ آپ جیسے متحرک اور سرگرم نوجوان جتنا بھی فخر کیا جائے وہ بہت کم ہے۔

آئے دن فیس بک اخبارات اور مختلف چینلوں پر آپ کی علمی وادبی سرگرمیوں کا مشاہدہ ہوتا رہتا ہے، جس سے نئی نسلوں کو سبق حاصل کرنے ضرورت ہے۔ یقیناً اللہ تعالیٰ نے اردو ادب کی خدمت کے لیے آپ کو منتخب فرمایا ہے۔ آپ کی جدوجہد اور کاوشیں علامہ شبلی نعمانیؒ کی روح کے لیے باعثِ تسکین ہوں گی۔

اخیر میں اس ناچیز کا ایک مشورہ یہ ہے کہ آپ ماہنامہ صدائے شبلی کے لیے ISSN نمبر ضرور حاصل کریں، تاکہ ان ریسرچ اسکالر اور مضمون نگار کو فائدہ پہنچے، جو اس سے وابستہ ہیں، اس سے ان کی حوصلہ افزائی بھی ہوگی اور ان کے مستقبل کے لیے کارآمد بھی ہوگا۔

میں جناب کا بیحد مشکور ہوں کہ آپ نے اس حقیر کو اپنے ٹرسٹ میں خدمت کا موقع عنایت کیا۔ اللہ تمام شرور فتن سے آپ اور آپ کے ادارہ کی حفاظت فرمائے۔

ڈاکٹر محمد فضیل ندوی

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی حیدرآباد

ڈاکٹر فضیل احمد ندوی صاحب! جنوری ۲۰۱۹ء کا شمارہ پڑھنے، اور پسند کرنے کا شکریہ۔ ISSN نمبر کے حصول کے لیے ہماری کوششیں جاری ہیں، ان شاء اللہ جلد ہی مل جائے گا۔ آپ نے اچھا خط لکھا ہے، اس کے لیے آپ کو مبارکباد۔

جامعۃ البنات الاصلاحیۃ حیدرآباد (ملک پیٹ)

لڑکیوں کی اعلیٰ دینی وعصری تعلیم کا فکری واصلاحی معیاری مرکز

شعبہ جات: تحفیظ القرآن الکریم ★ شعبہ ابتدائیہ (دوسال)
★ شعبہ عالمیت (چارسال) ★ شعبہ فضیلت (دوسال)

☆شہر سے اہم مقامات سے آمدورفت کی سہولت ☆دوردراز کی طالبات کے لیے ہاسٹل کا نظم ☆عثمانیہ یونیورسٹی سے میٹرک تا ایم۔اے امتحانات دلوانے کا نظم

لڑکیوں کے لیے قرآن، حدیث، فقہ، ادب، سیرت، تاریخ کے علاوہ انگریزی زبان کے اعدادیہ تا فضیلت چھ سال تعلیم کا بہترین نظم ہے

رابطے کے لیے پتہ:
JAMIATUL BANAT AL-ISLAHIYAH
#16-3-993/1, NEAR DAWN HIGH SCOOL
OFFICERS COLONY, NEW MALAKPET,
HYDERABAD(T.S) INDIA 500036

نصب العین: انقلاب بذریعہ تعلیم قرآن وسنت کی گہری بصیرت، شہادت حق، احیائے دین کی استعداد اور امت کے لیے داعیانہ، مجاہدانہ اور قائدانہ کردار کی حامل "المرأۃ الاصلاحیۃ" ٹیم کی تیاری۔
☆شعبہ تحفیظ القرآن اور شعبہ ابتدائیہ وعالمیت کے پہلے سال میں داخلے سال بھر جاری رہیں گے۔ اعلیٰ دینی تعلیم کے حصول کے خواہشمند سرپرست حضرات سے اپنی لڑکیوں کے ہمراہ جلد رجوع ہونے کی خواہش کی جاتی ہے۔

جامعۃ البنات الاصلاحیۃ حیدرآباد کا استحکام وقت کا اہم تقاضہ اور ملی فریضہ ہے۔ اس اہم مرکز کی تعمیر وترقی کے لیے مالی اور اخلاقی تعاون فرما کر ہمارے حوصلے کو قائم رکھیں۔

ناظم: مولانا عبدالعلیم اصلاحی
موبائل 9676202819

ڈاکٹر محمد محامد ہلال اعظمی ایڈیٹر "صدائے شبلی" حیدرآباد جنوری ۲۰۱۹ء کا شمارہ وزیر داخلہ تلنگانہ عالی جناب محمود علی صاحب کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے

ہیں، نشہ آور پودے، بیماری پہنچانے والے پودے۔ پیڑ پودوں کو نقصان دینے والے چرند پرند کا تذکرہ۔ ان سب چیزوں پر مولانا نے انتہائی اہم اور معلوماتی نظم لکھی ہے۔ بعض نظموں میں اللہ کی عظمت وقدرت بھی اجاگر کی گئی ہے۔ بچوں کو پیڑ پودے کی حفاظت اور ان سے فائدہ حاصل کرنے کا طریقہ بھی بتایا گیا ہے، ہر نظم میں بچوں کی دلچسپی کا بھرپور لحاظ کیا گیا ہے، میرے خیال سے اگر کوئی بچہ اس کتاب کو پڑھنا شروع کرے تو اس کو ختم کیئے بغیر سکون نہیں ملے گا۔

''یہ آب وہوا''

اس مجموعہ میں ابتدائی نظم ''سائنس کی اہمیت'' پر ہے، مولانا نے سائنس کو نہ صرف اللہ کی رحمت بتایا ہے، بلکہ کہا ہے کہ سائنس کے تعلق سے قرآنی آیات بھی ہیں، سائنس مسلمانوں کی وراثت ہے اور کھوئی ہوئی برسوں کی حکمت بھی۔ مذکورہ نظم میں انہوں نے اس حقیقت سے بھی اشارتاً روشناس کرایا ہے کہ جب مسلمانوں میں سائنس کی اہمیت تھی تو بغداد منور تھا اور یوروپ اندھیروں میں اور جب مسلمان سائنس سے دور ہوگئے اور اپنی قدیم میراث سے کنارہ کش ہوگئے تو بغداد پہ ظلمت چھا گئی اور آج یوروپ اسی سائنس کے ذریعہ ترقی کے آسمان پر روشن روشن ہے، جس کا مشاہدہ ہمارے سامنے ہے۔

بہر کیف اس کتاب میں آب و ہوا کے تعلق سے 46/ معیاری نظمیں لکھی گئی ہیں۔ ہوا کو دیکھا نہیں جا سکتا ہے، مگر ہوا بھی کئی قسم کی ہوتی ہے، مصنف نے جہاں ہوا کے فوائد کا تذکرہ کیا ہے، وہیں ہوا کے نقصانات کی بھی وضاحت کی ہے، ہوا کی آلودگی، خرابی، گندگی کو الگ الگ نظموں میں دلچسپ انداز میں بیان کیا ہے، ہوا کی آلودگی کے نقصانات اور اس سے حفاظت کا طریقہ بھی بتا دیا ہے، ساتھ ہی ہوا کی صفائی کے قدرتی انتظامات اور انسانی ذرائع کی معلومات فراہم کی ہے۔

اسی طرح آب یعنی پانی پر بھی متعدد نظمیں ہیں۔ ایک نظم میں انہوں نے پانی اہمیت پر روشنی ڈالی ہے، اس نظم میں پانی کو چار زبانوں، فارسی، عربی، انگریزی، ہندی اور اردو میں کیا کہتے ہیں، بچوں کو سمجھایا ہے۔ گندے، صاف، پانی کے اجزا، بارش کا پانی، اونچی زمین کا پانی، چشمہ کا پانی وغیرہ پر نظمیں بہت ہی معلوماتی ہیں، گندے پانی کو صاف کرنے کا طریقہ بھی بتا دیا۔

اس کے علاوہ ''یہ بدن کے حصے''۔ ''یہ زمین''۔ ''یہ مہینے اور موسم'' جیسی اور تین کتابیں ہیں جس پر ان شاء اللہ آئندہ تبصرہ کریں گے۔

DR. S.J HUSSAIN
MD (Unani)
Former director Incharge
Central Research Institute Of Unani Medicine
Govt of India

website: www.unanicentre.com
Email:syedjalilhussain@gmail.com
jaleel_hussain@yahoo.com

Dr. Jaleel's

یونانی سینٹر فار کارڈیک کیر
UNANI CENTER FOR CARDIAC CARE

Consultation Time
Morning:11:00 am to 2:30 pm-Evening:7:00 pm to 9:30 pm
(Friday Morning and Sunday Evening Closed)

Cell:
+91 8142258088
+91 7093005707

Adress -: No: 8-1-332/3/B-69, RoadNo 1(A)Arvind Nagar Colony
Tolichowki Hyderabad - 500008 T.S India